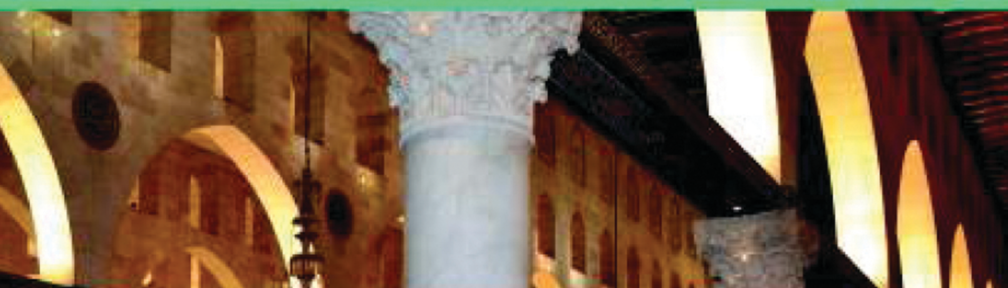
www.alrisala.org

الرسالہ

Al-Risala

Decembar 2005 • No. 349



وقت کے استعمال کا بجٹ بنائیے، جس طرح
آپ اپنی آمدنی اور خرچ کا بجٹ بناتے ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الرسالہ
Al-Risala

اردو اور انگریزی میں شائع ہونے والا
اسلامی مرکز کا ترجمان

زیر سرپرستی
مولانا وحید الدّین خاں
صدر اسلامی مرکز

دسمبر 2005

جَے پور کا سفر

New Release!



Al-Risala
1, Nizamuddin West Market
New Delhi-13
Tel. 2435 6666, 2435 ۵5454
Fax: 2435 7333
website: www.alrisala.org

Subscription Rates
Single copy Rs. 10,
One year Rs. 110, Two years Rs. 200,
Three years Rs. 300, Five years Rs. 480
Abroad: One year $20 (Air Mail)

Distributed in USA by
Al-Risala Forum International
Bensalem, PA 19020 (USA)
Tel/fax: 215-240-4298
e-mail:kkaleemuddin@gmail.com

Printed and published by
Saniyasnain Khan on behalf of
Al-Markazul Islami, New Delhi.

Printed at Nice Printing Press,
7/10, Parwana Road,
Khureji Khas, Delhi-110 051

جے پور کا سفر

جے پور کے سفر کا فیصلہ میرے لیے ایک مشکل فیصلہ تھا۔ عین اسی زمانے میں سویڈن میں ایک انٹرنیشنل کانفرنس تھی۔ اس کانفرنس کا اہتمام ''الرابطة الاسلامية في استاکهولم'' کی طرف سے کیا گیا تھا۔ رابطہ عالمِ اسلامی دنیا کی سب سے بڑی مسلم تنظیم ہے۔ یہ رابطے کی طرف سے ہونے والی سالانہ کانفرنس تھی۔ اس کانفرنس میں عام طور پر عرب علماء کو مدعو کیا جاتا ہے۔ اس بار خصوصی طور پر مجھے اس میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ یہ کانفرنس ۲۴۔۲۶ دسمبر ۲۰۰۴ کو سویڈن کی راجدھانی اسٹاک ہوم میں ہو رہی تھی۔ اس کانفرنس میں خطاب کے لیے مجھے جو موضوع دیا گیا تھا وہ یہ تھا:

How to Live in a Multi-religious Society: Islamic Point of View

اس سلسلے میں الرابطة الاسلامية (اسٹاک ہوم) کے دفتر (Tel: 0046-8-50910900) سے ان کا خط مورخہ ۱۴ دسمبر ۲۰۰۴ محمود درید ی (چیرمین) کے دستخط سے موصول ہو چکا تھا۔ اس خط میں درج تھا کہ وہ چاہتے ہیں کہ میں وہاں دو ہفتے قیام کروں۔ ٹیلی فون کے ذریعے مجھے اطلاع دی گئی تھی کہ عرب شرکاء جو میری عربی کتابیں پڑھے ہوئے ہیں وہ مجھ سے زیادہ سے زیادہ تبادلۂ خیال کرنا چاہتے ہیں۔ انھوں نے میرے مددگار کے ساتھ دو ایئر ٹکٹ کا بھی انتظام کر دیا تھا۔

اسٹاک ہوم سے بار بار ٹیلی فون آتے رہے۔ میں ذہنی طور پر اس سفر کے لیے تیار ہو چکا تھا۔ مگر اس دوران ایک اور اصرار سامنے آ گیا۔ وہ یہ کہ انٹگرل ہیومنزم (Integral Humanism) کے نام سے قائم شدہ تنظیم کی طرف سے دعوت نامہ موصول ہوا جس میں مجھے جے پور (راجستھان) میں منعقد ہونے والے سیمینار میں خصوصی اسپیکر کی حیثیت سے شرکت کی باصرار دعوت دی گئی تھی۔ یہ سیمینار ۱۸۔۱۹ دسمبر ۲۰۰۴ کو جے پور میں ہو رہا تھا۔ تاریخوں کی قربت کی وجہ سے میں دونوں میں سے ایک ہی جگہ جا سکتا تھا۔ آخر کار میں نے یہ طے کیا کہ میں سویڈن کا سفر چھوڑ دوں اور جے پور کے سیمینار میں شرکت کروں۔ چنانچہ سویڈن کے دعوت نامے کو ترک کر دینا پڑا۔ میں نے سویڈن کانفرنس کے منتظمین کو متعلقہ

موضوع پر اپنے مختصر خیالات ای میل کے ذریعے بھیج دیے اور جے پور کے سفر کا فیصلہ کرلیا۔

دہلی سے جے پور کا فاصلہ ۳۱۳ کیلومیٹر ہے۔ اس سفر کے لیے میرے سامنے دو انتخاب تھے۔ ہوائی جہاز سے جانا یا روڈ کے راستے سے بذریعے کار سفر کرنا۔ میرے ذہن میں ان دو کے سوا کوئی تیسرا انتخاب نہ تھا۔ مگر ۱۶ دسمبر کی رات کو غیر متوقع طور پر ایک خواب دیکھا۔ میں نے دیکھا کہ میں سفر کررہا ہوں۔ یہ سفر جدید طرز کی ایک ٹرین میں ہو رہا ہے اور ڈبّے کی تقریباً نصف سیٹیں خالی ہیں۔

صبح کو سیمینار کے ایک ذمے دار، مقیم دہلی، مسٹر چاند ملاقات کے لیے آئے۔ انھوں نے کہا کہ ہم نے مشورہ کیا ہے کہ آپ کے لیے اور آپ کے ساتھی کے لیے دہلی۔ جے پور شتابدی اکسپریس میں اگزیکیٹو کلاس سے ریزرویشن کرایا جائے۔ یہ آپ کے لیے ہوائی جہاز اور کار دونوں کے مقابلے میں زیادہ بہتر ہوگا۔ شام کو انھوں نے اس کے مطابق دو ٹکٹ بھیج دیے۔

۱۸ دسمبر کی صبح کو ساڑھے سات بجے جب کہ میں ٹرین میں یہ سفر نامہ لکھوا رہا ہوں۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اس سفر کے لیے ٹرین کا انتخاب زیادہ بہتر تھا۔ ہوائی جہاز میں فاگ (fog) کا تقریباً یقینی اندیشہ تھا۔ کار کا سفر بھی اندیشے سے خالی نہ تھا۔ کیونکہ میں کار سِک ہوں اور کار کے سفر میں مجھے چکر آنے لگتا ہے۔ تاہم میرے ذہن میں بالکل یہ تصور نہیں تھا کہ مجھے یہ سفر ٹرین سے کرنا چاہیے۔ میرا ذہن اس معاملے میں خالی تھا۔ ۱۶ دسمبر کو ٹرین کے ذریعے سفر کا خواب میرے لیے ایک خدائی رحمت تھا۔ اس خواب میں مجھے غالباً دو بشارتیں دی گئی تھیں۔ ایک یہ کہ جے پور کا یہ سفر انڈین علاقے میں تھا۔ اس لحاظ سے یہ اس بات کی بشارت تھی کہ سویڈن کا سفر چھوڑ کر جے پور کا سفر کرنا میرے لیے ایک صحیح انتخاب ہے۔ دوسرے یہ کہ جے پور کا سفر بذریعے ٹرین کرنے کا فیصلہ زیادہ درست فیصلہ تھا۔

اس خواب پر میں نے غور کیا تو میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ آدمی اس طرح جیے کہ اس نے خدا کو اپنا سب سے بڑا کنسرن بنالیا ہو۔ جو آدمی خدا کو اپنا کنسرن بنالے، خدا بھی اس کو اپنا کنسرن بنالیتا ہے۔ اور پھر ہر موقع پر اس کو صحیح رہنمائی دیتا رہتا ہے۔ کبھی انسپریشن (inspiration) کی صورت میں، اور کبھی خواب کی صورت میں، جس کو

حدیث میں وحی کا چھیالیسواں حصہ بتایا گیا ہے (مشکوٰۃ المصابیح 64:8)

دہلی۔جے پور شتابدی اکسپریس کی جس کوچ میں میں نے سفر کیا اس میں میرے سامنے کی دیوار پر دائیں بائیں دو خوبصورت تصویریں لگی ہوئی تھیں۔بائیں طرف کی رنگین تصویر میں دکھایا گیا تھا کہ ایک بیل کچے راستے پر ایک گاڑی کو کھینچ رہا ہے۔جس کے مقابلے میں دائیں طرف کی خوبصورت تصویر میں نظر آرہا تھا کہ ایک ریلوے انجن ٹرین کے ساتھ لوہے کی پٹری پر دوڑ رہا ہے۔ان دونوں تصویروں میں گویا انسان کے سفری ارتقاء کو مصوّر کیا گیا تھا۔وہ تصویر کی صورت میں بتا رہا تھا کہ انسان کس طرح حیوانی سفر کے مرحلے سے گزر کر مشینی سفر کے مرحلے تک پہنچا ہے۔یہ خدا کی رحمت کا کیسا عجیب نمونہ ہے کہ اس نے انسان کی پیدائش کے ساتھ پیشگی طور پر اس کے لیے حیوانی سواریوں کا انتظام کیا، اور پھر انسان کو یہ موقع دیا کہ اپنی عقل استعمال کر کے مشینی سواریاں ایجاد کرے اور تاریخ کو مشینی دور تک پہنچائے۔گھوڑا، اس معاملے کی ایک عجیب مثال ہے۔

شتابدی اکسپریس کی ایگزیکیٹو کوچ غالباً جرمنی سے امپورٹ کی گئی ہے۔انڈین ریلوے کے معیار سے اس کو ایک اعلیٰ کلاس کہا جا سکتا ہے۔کوچ کی آدھی سے زیادہ سیٹ خالی تھی۔اس کوچ میں میرے سوا زیادہ تر مغربی سیاح تھے اور کچھ ہندستانی، جو بظاہر لیڈر یا سرکاری افسر معلوم ہوتے تھے۔ لیکن ظاہری مادی سہولتوں کے باوجود مجھے اس کے اندر سکون حاصل نہ تھا۔اس کا سبب یہ تھا کہ عام ذوق کے مطابق، اس کے اندر مسلسل میوزک کی آواز آرہی تھی۔مسافروں کے موبائل ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی تھی اور وہ اپنے دور کے ساتھیوں سے بات کرنے لگتے تھے۔

مجھے یاد آیا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ میں اپنی اہلیہ خدیجہ کے ساتھ رہتے تھے اس وقت آپ کو آپ کے پڑوسیوں کی طرف سے طرح طرح کی اذیتیں پہنچتی تھیں۔ایک دن جبریل آپ کے پاس آئے۔انھوں نے کہا کہ خدیجہ کو خدا نے سلام کہلایا ہے اور یہ کہا ہے کہ تمہارے لیے جنت میں ایک ایسا مکان تیار ہے جہاں نہ کوئی شور ہوگا اور نہ کوئی تکلیف (**لا صخب فیہ و لا نصب**) (صحیح مسلم، فضائل الصحابۃ) میں نے سوچا کہ دنیا میں آدمی کے پاس مادی اعتبار سے خواہ سب کچھ

ہوجائے لیکن پھر بھی اس کو یہاں سکون حاصل نہیں ہوسکتا۔ دوسرے اسباب کے علاوہ اُس کا ایک خاص سبب وہ ہے جس کا اشارہ قرآن کے ان الفاظ میں ملتا ہے: حسن اولٰئک رفیقا (النساء ۶۹) جنت کی دوسری امتیازی صفتوں کے علاوہ اس کی ایک صفت یہ ہے کہ وہاں صرف منتخب لوگ جگہ پائیں گے۔ جنت سچے انسانوں کے پڑوس میں رہنے کا نام ہے۔ اس حقیقت کو ایک فارسی شاعر نے کسی قدر طنزیہ انداز میں اس طرح بیان کیا ہے:

بہشت آں جا کہ آزارے نہ باشد کسے را با کسے، کارے نہ باشد

طبعی طور پر مجھے خاموشی پسند ہے۔ جب میں لوگوں کو غیر ضروری طور پر بولتے ہوئے دیکھتا ہوں تو میری زبان پر درد کے ساتھ یہ الفاظ آجاتے ہیں۔ یہ زبان کا مصرفانہ استعمال ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ من صمت نجا (جو چپ رہا اس نے نجات پائی) اس کا مطلب میری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ جو شخص کم بولے گا وہ زیادہ سوچے گا اور جو شخص زیادہ سوچے گا اس کو یہ موقع ملے گا کہ وہ فکری اور روحانی اعتبار سے زیادہ ترقی کرے۔ اور نتیجۃً اپنے آپ کو ضیاع سے بچا لے۔

موجودہ زمانے میں خدا نے انسان کو نہایت قیمتی چیزیں عطا کیں۔ مگر میرے تجربے کے مطابق، بیش تر لوگ ان کا صرف غلط استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً جدید کمیونیکیشن خدا کی ایک عظیم نعمت ہے مگر غالباً اس نعمت کا تقریباً ۹۵ فیصد حصہ صرف بے فائدہ یا غلط مقاصد کے لیے استعمال ہو رہا ہے۔ اور جہاں تک کہ اس نعمت پر شکر کا تعلق ہے وہ تو میں نے اپنے تجربے میں حقیقی طور پر کسی کے اندر پایا ہی نہیں، نہ مذہبی لوگوں میں نہ سیکولر لوگوں میں۔ اس معاملے میں دونوں کی حالت ایک ہے۔

میرے آگے کی سیٹ پر ایک صاحب بیٹھے ہوئے تھے جو بظاہر ایک لیڈر معلوم ہوتے تھے۔ ان کا موبائل ٹیلی فون ہر وقت بجتا رہتا تھا۔ ہر چند منٹ پر ان کے پاس کہیں سے ایک کال آتی تھی۔ سفر کے دوران وہ مسلسل موبائل پر بات کرتے رہے۔ ان کے پاس تین موبائل فون تھے۔ موبائل ٹیلی فون بلاشبہہ ایک نعمت ہے مگر موجودہ زمانے میں مصنوعی تعلقات کی کثرت نے موبائل فون کو ایک زحمت میں تبدیلی کر دیا ہے۔ دنیا کی زندگی میں سب سے بڑی نعمت کسی انسان کے لیے یہ ہے کہ اس کا ربط خدا

کے ساتھ قائم ہو جائے۔ اس کے اور خدا کے درمیان وہ تعلق ہو جس کو حدیث میں ''یُناجی ربہ'' کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ اس اعلیٰ ربط کے امکانات ہر وقت موجود رہتے ہیں لیکن انسان نے اپنے آپ کو غیر خدائی تعلقات سے اتنا زیادہ باندھ رکھا ہے کہ اس کے پاس خدائی تعلقات کے لیے وقت نہیں۔ اگر چہ یہ غیر خدائی تعلقات اکثر مصنوعی اور غیر ضروری ہوتے ہیں۔ جو شخص ہر وقت مناجاتِ انسانی میں مشغول ہو وہ کبھی مناجاتِ خداوندی کا تجربہ نہیں کر سکتا۔

ٹرین کے دوران مطالعے کے لیے ۱۸ دسمبر کے دو انگریزی اخبار موجود تھے۔ ایک ٹائمس آف انڈیا اور دوسرے ہندستان ٹائمس۔ ٹائمس آف انڈیا (۱۸ دسمبر ۲۰۰۴) کے پہلے صفحے پر یہ خبر تھی کہ ۲۵ سال کولاوینو وینکاٹش (Kolavennu Venkatesh) کا انتقال ۱۷ دسمبر ۲۰۰۴ کو ہو گیا۔ وہ بچپن سے ایک لا علاج بیماری Muscular dystrophia میں مبتلا تھا۔ جب اس کو معلوم ہوا کہ وہ زندہ نہیں بچے گا تو اس نے چاہا کہ وہ اپنے جسم کو عطیے میں دے دے تا کہ طبعی موت سے پہلے اس کے اعضاء ضرورت مندوں کو پیوند کاری کے لیے دیے جاسکیں۔ یہ مسئلہ عدالت میں گیا لیکن عدالت نے نوجوان کو اس عطیے کی اجازت نہیں دی۔

اس واقعے پر ٹائمس آف انڈیا نے اپنے ۱۸ دسمبر کے شمارے میں ایڈیٹوریل لکھا تھا جس کا عنوان یہ تھا: آخری آزادی (The Final Freedom) اس ایڈیٹوریل میں کہا گیا تھا کہ عدالت نے مذکورہ نوجوان کو موت سے پہلے اپنے اعضاء عطیے میں دینے کی اجازت نہ دے کر اس کو اس سے محروم کر دیا کہ وہ دوسروں کے کام آسکے۔ وینکاٹش چاہتا تھا کہ وہ درخت کی اس پتی کی طرح دنیا سے رخصت ہو جو درخت سے ٹوٹ کر زمین پر گرتی ہے تا کہ وہ زمین کو زرخیز کر سکے:

> Venkatesh wished to leave life like a leaf that falls off the tree only to enrich the earth.

مگر قانون نے وینکاٹش کو ایسا کرنے کی اجازت نہ دی۔ اخبار کا یہ تبصرہ اس مفروضے کی بنیاد پر ہے کہ موت کے بعد انسان کا وجود ختم ہو جاتا ہے۔ مگر یہ مفروضہ بجائے خود غلط ہے جس پر اس

تبصرے کی بنیاد قائم کی گئی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ موت انسان کے اگلے وسیع تر مرحلۂ حیات میں داخلے کا دروازہ ہے۔ ایسی حالت میں کسی انسان کے لیے وہی روش درست ہے جو اگلے مرحلۂ حیات میں اس کے کام آئے۔ یہ بطور خود ایک معیار قائم کرکے اس پر اپنا فیصلہ دینا ہے۔ مگر جب یہ معیار غلط ہو تو فیصلہ بھی یقینی طور پر غلط ہو جائے گا۔

ہندستان ٹائمس (۱۸ دسمبر ۲۰۰۴) میں مسٹر خشونت سنگھ کا ہفتے وار کالم شائع ہوا تھا۔ اس کی سرخی یہ تھی: (Spirit is Unwilling) اس کے تحت درج تھا کہ اخباری رپورٹ سے معلوم ہوا ہے کہ لوگوں نے ڈاکٹر من موہن سنگھ کو یہ مشورہ دیا کہ ہندستان میں ایک روحانی وزارت (ministry of spiritualism) قائم کی جائے۔ یہ تجویز یقینی طور پر بے معنی ہے کیوں کہ روحانیت کے نام پر وزارت قائم کرنے سے ملک میں روحانیت نہیں آتی۔ روحانیت ایک روحانی شخص کے ذریعے آتی ہے نہ کہ کسی سرکاری محکمے کے ذریعے۔

مضمون نگار نے لکھا ہے کہ روحانیت کے نام پر ملک میں بہت سے لوگ اپنی سرگرمیاں جاری کیے ہوئے ہیں۔ مگر ان سرگرمیوں سے اب تک صرف روحانی پیشواؤں کو فائدہ ہوا ہے۔ یہ لوگ بڑے بڑے آشرم بنائے ہوئے ہیں۔ وہ پورے ملک میں سفر کرتے رہتے ہیں۔ وہ دولت مندوں کے گھروں میں ٹھہرتے ہیں۔ ان کے پاس کاریں ہیں اور وہ آرام کے ساتھ رہتے ہیں۔ لیکن ان سرگرمیوں کا کوئی اثر عوام تک نہیں پہنچا ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہم دنیا کی سب سے اچھی قوم بن گیے ہوتے:

> They have huge ashrams, travel all over the country, stay in homes of the rich, have cars and live in comfort. Does reading sacred texts or listening to sermons have any impact on people? If it did, we should have become the most pious, god-fearing and honest people in the world.

یہ مسئلہ روحانیت کا نہیں ہے۔ اصل مسئلہ یہ ہے کہ موجودہ زمانے کے جدید مواقع نے لوگوں کو پروفیشنل بنا دیا ہے۔ اب ہر چیز ایک پروفیشن بن گئی ہے۔ سیاست، صحافت، ایجوکیشن اور اسی طرح مذہب اور روحانیت ہر چیز نے پروفیشن کی صورت اختیار کرلی ہے۔ ایسی حالت میں مذکورہ الفاظ ہر شعبے پر صادق آتے ہیں نہ کہ صرف روحانیت پر۔ اس مسئلے کا حل یہ ہے کہ لوگوں کو پروفیشنلزم اور کیریرزم

سے اوپر اٹھایا جائے۔ فائدے کے بجائے مقصد کو ترجیحی درجہ دیا جائے۔

ٹرین کے اندر اعلانات ہورہے تھے۔ دس بجے یہ اعلان ہوا کہ جلد ہی ہم الور پہنچنے والے ہیں۔ الور کی خصوصیات کے بارہ میں بتایا گیا کہ وہ اپنی وائلڈ لائف سینکچوری کے لیے مشہور ہے۔ مجھے یاد آیا کہ حال میں اخبارات میں شیروں کے بارے میں ایک رپورٹ آئی تھی۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ انڈیا کے چڑیا گھر اچھی حالت میں نہیں ہیں۔ چنانچہ تقریباً ڈیڑھ سو شیر چڑیا گھروں سے نکال کر جنگلوں میں چھوڑے جانے والے ہیں ''تاکہ وہاں وہ اپنی طبعی موت مرجائیں''۔ رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ یہ شیر وہ ہیں جو افریقی شیر اور ہندستانی شیر کے کراس بریڈنگ (Cross Breeding) سے پیدا ہوئے تھے۔ ان شیروں کے اندر جسم کا مدافعتی سسٹم (immune system) بگڑ گیا ہے۔ چنانچہ ان کے اندر بیماریوں سے مقابلہ کرنے کی صلاحیت بہت کم ہوگئی ہے۔ وہ طرح طرح کے عوارض میں مبتلا رہتے ہیں۔ کوئی علاج ان کے لیے کارگر ثابت نہیں ہوا۔ آخر میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ ان کو چڑیا گھر سے رہا کرکے جنگلوں میں ڈال دیا جائے جہاں وہ اپنے آپ مرجائیں۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ نیچر کے نظام میں مداخلت کتنی زیادہ خطرناک ہے۔ اس کا ثبوت بار بار ملا ہے۔ مثلاً مختلف ملکوں میں ڈیم بنا کر پانی کے فطری نظام میں جو مداخلت کی گئی اس کا فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہوا۔ برطانیہ میں گایوں کی خوراک میں نباتاتی اجزا کے ساتھ لحمی اجزا ملائے گیے۔ اس کی وجہ سے ان کا دودھ غیر صحت مند ہوگیا۔ اسی طرح نباتاتی فصلوں میں موجودہ زمانے میں وہ ملاوٹی طریقہ اختیار کیا گیا جس کو ہائی برڈ (hybrid) کہا جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں جو فصلیں حاصل ہوئیں وہ طبی نقطۂ نظر سے ناقص تھیں۔ اس فہرست میں جدید تباہ کن صورت وہ ہے جو ایڈس کی بیماری کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ خدا نے جنسی تعلقات کے لیے فطری طریقہ شوہر اور بیوی کا ازدواجی طریقہ بنایا تھا۔ موجودہ زمانے میں آزادی کے نام پر ازدواجی زندگی سے باہر، جنسی تعلق شروع کردیا گیا۔ یہی غیر فطری تعلق ہے جس نے ایڈس کی شکل میں ایک ایسی بیماری کی صورت اختیار کرلی جو دورِ جدید کی سب سے مہلک بیماری تصور کی جاتی ہے۔

ایڈس کی بیماری کا علاج تلاش کرنے کے لیے اربوں روپیے خرچ کیے جا رہے ہیں۔ حالاں کہ اس کا سادہ علاج یہ ہے کہ لوگ غیر فطری تعلقات کو چھوڑ کر ازدواج کا فطری تعلق اختیار کریں۔ قرآن کے الفاظ میں وہ **غیر مسافحین** (النساء: ۲۴) بن جائیں۔

ٹرین کسی قدر لیٹ ہو کر جے پور اسٹیشن پہنچی۔ اپنے کو کچھ نہ سمجھنے کا مزاج میرے اندر اتنا زیادہ ہے کہ جب بھی میں کوئی سفر کرتا ہوں تو ہمیشہ اپنے داخلی احساس کے تحت مجھے یہ اندیشہ رہتا ہے کہ اسٹیشن پر یا ائرپورٹ پر کوئی شخص میری رہبری کے لیے موجود نہ ہو تو کیا ہوگا۔ اس اندیشے کے تحت میں نے دہلی میں کانفرنس کے نمائندے مسٹر چاند سے کہا کہ مجھے جے پور کا نمبر اور پتہ دے دیجیے تاکہ ضرورت ہو تو اسٹیشن پہنچ کر کانٹیکٹ کرسکوں۔ انھوں نے کہا کہ آپ اس کی فکر نہ کریں۔ آپ جب جے پور ریلوے اسٹیشن پر پہنچیں گے تو وہاں بہت سے لوگ آپ کا سواگت کرنے کے لیے موجود ہوں گے۔ چنانچہ عملاً ایسا ہی ہوا۔ میرے اندیشے کے خلاف اسٹیشن پر بہت سے لوگ موجود تھے۔ میں نے کثرت سے سفر کیے ہیں مگر میرا مذکورہ اندیشہ کبھی درست ثابت نہیں ہوا۔ اس میں صرف ایک استثناء ہے اور وہ کیسابلانکا کا ہے جہاں میں ایک عرب کانفرنس کی دعوت پر اس میں شرکت کے لیے گیا تھا۔

ان لوگوں کے ساتھ روانہ ہو کر جے پور کے ہوٹل لکشمی ولاس پہنچا۔ یہاں روم نمبر ۵ میں میرے لیے ٹھہرنے کا انتظام تھا۔ یہ ہوٹل عام طریقے کے خلاف فطری انداز میں بنایا گیا ہے۔ کشادہ کمرہ اور ہر طرف کھلی جگہ اس کی امتیازی صفت تھی۔ اپنے فطری انداز کی بنا پر یہ ہوٹل مجھے پسند آیا۔

ہوٹل پہنچا تو وہاں اخبار والے اور ٹی وی والے انتظار کر رہے تھے۔ ان کی فرمائش کے مطابق انھیں انٹرویو دیا۔ ای ٹی وی کے نمائندے مسٹر خورشید نے سوال کا آغاز کرتے ہوئے کہا کہ آپ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ''آپ پرو بی جے پی ہیں''۔ میں نے کہا کہ یہ بات بالکل بے بنیاد ہے کہ میں پرو بی جے پی ہوں۔ میں صرف پرو انسان ہوں۔ بھارت میرا دیش ہے۔ اور اس دیش کے ہر مرد اور عورت میرے بہن اور بھائی ہیں۔ میں سب کو ایک نظر سے دیکھتا ہوں۔ میں پولیٹکل آدمی نہیں ہوں بلکہ میں ایک صوفی ہوں۔ صوفیوں کا طریقہ صلحِ کل (peace with all) کا طریقہ ہے۔ کسی کو اپنا اور

کسی کو غیر سمجھنا، یا کسی کو دوست اور کسی کو دشمن سمجھنا، یہ سب صوفی کلچر کے خلاف ہے۔

ہندی اخبار مہانگر ٹائمس کے نمائندے نے خاص طور پر یہ سوال کیا کہ شریعت میں طلاق کا مسئلہ کیا ہے۔ میں نے کہا کہ اس معاملے میں دو بڑے گروپ ہیں۔ ایک حنفی گروپ اور دوسرا سلفی گروپ۔ تین طلاق کے معاملے میں، میں سلفی مسلک کو عملاً درست مانتا ہوں۔ اس مسلک کے لوگ ایک بیٹھک میں تین طلاق کو ایک طلاق قرار دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جب کوئی آدمی طلاق، طلاق، طلاق کہتا ہے تو وہ غصے کی وجہ سے بطور تشدید اس کو بار بار دہراتا ہے۔ لہذا سلفی مسلک والے تین طلاق کو ایک مان کر شوہر سے کہتے ہیں کہ اگر تم نے طلاق کا فیصلہ کر لیا ہے تو صحیح شرعی اصول کے مطابق، تین مہینے میں اس کی تکمیل کرو۔ یہ انٹرویو اسی دن اخبار کے شام کے ایڈیشن میں شائع ہوا۔ ہوٹل کے کمرے میں لوگ مسلسل آتے رہے اور ان سے ملکی اور ملّی معاملات پر گفتگو جاری رہی۔ ایک صاحب کے سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ میرا مشن مختلف سماجی گروپ کے درمیان میل ملاپ بڑھانا ہے۔ میرا یہ ماننا ہے کہ انٹریکشن (interaction) اتنا زیادہ مفید ہے کہ اس کو ہر حال میں اور ہر سطح پر جاری رہنا چاہیے۔

ایک اور سوال کے جواب میں میں نے کہا کہ یہ ایک غلط مفروضہ ہے کہ مسلمان اس ملک میں ترقی نہیں کر رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس ملک میں مسلمان ہر شعبے میں ترقی کر رہے ہیں۔ یہ فطرت کے قانون کے عین مطابق ہے۔ یہ کہنا کہ مسلمان ترقی کر رہے ہیں، یہ دعویٰ کرنا ہے کہ فطرت کا قانون یہاں معطل ہو گیا ہے۔ فطرت کا قانون خالق نے مقرر کیا ہے، وہ کبھی بدلنے والا نہیں۔ اس لیے مسلمانوں کی ترقی بھی رکنے والی نہیں۔

۱۸ دسمبر کی شام کو جے پور کے برلا آڈیٹوریم میں خطاب تھا۔ اسی کے لیے مجھے یہاں بلایا گیا تھا۔ برلا آڈیٹوریم جے پور کا سب سے بڑا آڈیٹوریم ہے۔ شام کو ٦ بجے جب میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ وہاں پہنچا تو وسیع ہال کی تمام سیٹیں بھر چکی تھیں۔ اوپر کی منزل بھی بھری ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ بڑی تعداد میں لوگ ہال کے باہر کھڑے ہوئے تھے۔ مجمع میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے۔

لوگوں نے بتایا کہ اس پروگرام کے لیے جے پور شہر کے باہر سے بھی کافی لوگ آئے تھے۔اس اجتماع کو پربھات پرکاشن دہلی اور جے پور کے سنیل کوٹھاری جوئلر نے اسپانسر(sponsor) کیا تھا۔اس پروگرام کا مقصد یہ تھا کہ ہندو۔مسلم تعلقات کو بہتر بنایا جائے اور انڈیا اور پاکستان کی دوری کو کم کیا جائے۔

میں نے تقریر میں جو باتیں کہیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ موجودہ زمانے میں مسلمانوں کے اندر علیحدہ قومی شناخت کا نظریہ پیدا ہوا جو روح عصر کے بھی خلاف تھا اور اسلام کے بھی خلاف۔آپ قرآن کو پڑھیں تو آپ پائیں گے کہ قرآن بار بار انسان کا ذکر کرتا ہے۔اس میں پوری انسانیت کو ایڈریس کیا گیا ہے۔قرآن کے مطابق، ساری دنیا دارالانسان ہے۔یہی زندگی کا فطری طریقہ ہے۔ قومی پہچان کو لے کر زندگی کے الگ الگ دائرے بنانا، اسلام کے آفاقی تصور سے مطابقت نہیں رکھتا۔ پھر میں نے کہا کہ یہ بات میرے لیے نئی نہیں ہے۔اب میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔لیکن نوجوانی کی عمر سے میرے یہی خیالات رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ تقریباً ۶۵ سال پہلے کی بات ہے۔ میں نے مدرسے میں اسماعیل میرٹھی کی اردو ریڈر پڑھی۔اس میں دو چڑیوں، باز ندہ اور یاز ندہ کا قصہ پڑھا۔اس میں ایک نے دوسرے سے کہا کہ چلو سیر کریں اور دنیا کو دیکھیں۔اس نے کہا:

سیر کر دنیا کی غافل! زندگانی پھر کہاں　　زندگی گر کچھ رہی تو نوجوانی پھر کہاں

یہ میری نوجوانی کا زمانہ تھا۔ مجھے شوق ہوا کہ میں بھی دنیا کی سیر کروں۔ میرے گاؤں (اعظم گڑھ) کے قریب شاہ گنج براڈ گیج کا ایک ریلوے اسٹیشن تھا۔ میں وہاں پہنچا۔اس زمانے میں انڈیا اور لاہور کے درمیان سفر کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ میں نے ۱۲ روپیے کا ٹکٹ لیا اور ایک ایکسپریس ٹرین میں بیٹھ گیا جو شاہ گنج سے سیدھے لاہور جاتی تھی۔

میں لاہور اسٹیشن پر اترا۔اس وقت لاہور میں کوئی بھی شخص میرا جاننے والا نہ تھا۔اسٹیشن کے قریب ایک مسجد میں اپنا مختصر سامان رکھا اور لاہور کی ایک سڑک پر پیدل روانہ ہو گیا۔اس دوران میری ملاقات ایک مسلمان سے ہوئی جن کا نام مسٹر قریشی تھا۔وہ ایک ٹیلر ماسٹر تھے۔میری کہانی سن کر وہ مجھ کو اپنے گھر لے گیے۔اگلے دن انھوں نے میری ملاقات لیلا رام سے کروائی۔لاہور کے مال روڈ پر ان

کی ٹیلرنگ کی بڑی دکان تھی جس کے باہر یہ سائن بورڈ لگا ہوا تھا:

B. Leela Ram & Sons

مسٹر قریشی اور بی لیلا رام دونوں مجھ سے اس طرح ملے جیسے کہ وہ میرے سگے بھائی ہوں۔ ان لوگوں کے ساتھ میں دو ہفتے لاہور میں رہا۔ اس کے بعد انھوں نے اپنی طرف سے میرا ٹکٹ لے کر دوبارہ اسی اکسپریس ٹرین پر بٹھا دیا اور میں واپس اپنے گھر آ گیا۔

یہ تقسیم ہند سے بہت پہلے کا واقعہ ہے۔ اس وقت میرا احساس یہ تھا کہ اعظم گڑھ اور لاہور دونوں میرے اپنے دیش کے شہر ہیں۔ مسٹر قریشی اور بی لیلا رام یکساں طور پر میرے بھائی ہیں۔ ہمالیہ کے دامن میں پھیلا ہوا پورا علاقہ میرا اپنا ملک ہے۔ یہی وہ آفاقی احساس ہے جس سے میں نے اپنی زندگی شروع کی اور آج بھی میں اس احساس میں جی رہا ہوں۔ گلوبلائزیشن کے دور نے میرے اس احساس کو اور زیادہ پختہ کیا ہے۔ مزید یہ کہ اسی آفاقی احساس کو میں انسانی فطرت کے مطابق سمجھتا ہوں اور یہی میرے نزدیک اسلام کا تقاضا بھی ہے۔ آپ قرآن کو پڑھیں تو آپ دیکھیں گے کہ قرآن زمین کے سارے باشندوں کو انسان کے لفظ سے خطاب کرتا ہے۔ گویا کہ قرآن کے نزدیک ساری دنیا دارالانسان ہے۔ یہی میرا عقیدہ ہے اور یہی میری تمنا۔ موجودہ زمانے کے مسلمانوں نے سیاسی معنوں میں ''ہر ملک، ملکِ ما است، کہ مِلکِ خدائے ما است'' کو تو دریافت کیا۔ مگر وہ اس حقیقت کو آفاقی فطرت کے اعتبار سے دریافت نہ کر سکے۔

جلسے کے بعد جن ہندوؤں اور مسلمانوں سے میری ملاقات ہوئی ان سب نے باتفاق یہ کہا کہ برلا آڈیٹوریم میں اتنا بڑا جلسہ ایک مسلم عالم کے لیے کبھی نہیں ہوا۔ یہاں جو ہندو اور مسلمان آئے تھے وہ اصلاً آپ ہی کی تقریر سننے کے لیے آئے تھے۔ آپ ہی سب کے لیے مکھیہ اٹریکشن تھے۔ ۱۹ دسمبر کو جے پور کے اخبارات میں جلسے کی جو رپورٹ شائع ہوئی اس نے اس کی تصدیق کر دی۔ ہر اخبار کی رپورٹ میں میری تقریر کو نمایاں کیا گیا تھا۔

۱۸ دسمبر کو برلا آڈیٹوریم کے پروگرام کے بعد میں اپنے ہوٹل میں پہنچا۔ یہاں شام کے کھانے

پر شہر سے دو درجن ممتاز افراد مدعو کیے گیے تھے۔ ان کے ساتھ شام کو خالص راجستھانی کھانا کھایا۔ ان لوگوں سے دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ ملک کے مستقبل پر بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ میں ایک آشاوادی آدمی ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے ملک کے ہندو اور مسلمانوں کے درمیان ایک نیا پراسس شروع ہو چکا ہے۔ وہ وقت آنے والا ہے جب کہ دونوں دو بھائیوں کی طرح مل کر ملک کا مستقبل بنائیں۔ اس پر ایک صاحب نے شک ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ مجھے ابھی زیادہ اثر دکھائی نہیں دیتا۔ ایک اور صاحب نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ ایک تالا آپ توڑ رہے ہوں اور وہ سویں چوٹ پر ٹوٹے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ۹۹ چوٹیں بیکار تھیں۔ کیوں کہ ۹۹ چوٹ کے بعد ہی یہ ممکن ہوا کہ ۱۰۰ ویں چوٹ لگنے پر تالا ٹوٹ جائے۔ ابھی جو کچھ ہو رہا ہے وہ سویں چوٹ سے پہلے کا مرحلہ ہے۔ سویں چوٹ کے لیے آپ کو ابھی تھوڑا انتظار کرنا چاہیے۔

ایجوکیشن منسٹر دونانی جی نے بتایا کہ راجستھان میں تعلیم بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ حال میں ہم نے ریاست میں ۱۲ ہزار نیے اسکول کھولے ہیں۔ ہماری کوشش ہے کہ ہر گاؤں کے ایک کیلومیٹر کے فاصلے پر ایک اسکول موجود ہو۔ انھوں نے کہا کہ پہلے راجستھان، ایجوکیشن میں پورے ملک کے اعتبار سے ۲۴ ویں نمبر پر تھا۔ اب وہ اس اعتبار سے چھٹے نمبر پر آ گیا ہے۔

۱۹ دسمبر کی صبح کو سو کر اٹھا تو باہر سے تیتر کی آواز سنائی دی۔ ہوٹل کے قریب ایک بہت بڑا پارک ہے جس میں کثرت سے درخت لگے ہوئے ہیں۔ اسی پارک کی طرف سے یہ آواز آ رہی تھی۔ یہ آواز سن کر میں نے سوچا کہ دنیا میں لاکھوں قسم کے پرندے اور حیوانات ہیں۔ مگر ہر ایک کی آواز دوسرے سے الگ ہے۔ آدمی صرف آواز کو سن کر پہچان سکتا ہے کہ یہ آواز کس پرندے یا کس جانور کی ہے۔ اسی طرح دنیا میں اربوں کی تعداد میں عورت اور مرد بستے ہیں مگر ہر ایک کی آواز دوسرے سے الگ ہے۔ آوازوں کے اس تنوع (diversity) پر سوچتے ہوئے میں نے کہا کہ خالق کی قدرت کا یہ کیسا عجیب نمونہ ہے کہ بے شمار قسم کی زندہ چیزیں زمین پر موجود ہیں۔ مگر ہر ایک کی آواز دوسرے سے الگ ہے۔ یہ تنوع اور اس قسم کے دوسرے واقعات خدا کی اتھاہ قدرت کا حیرت ناک ثبوت ہیں۔ آدمی فطرت

کے ان مظاہر پر غور کرے تو وہ شدت تاثر سے سجدے میں گر پڑے اور یہ کہے: **تبارک اللہ احسن الخالقین** (المؤمنون: ۱۴)

اس ہوٹل کے چاروں طرف کھلی جگہ تھی۔ ہوائی کثافت یہاں تقریباً نہیں کے برابر ہے۔ صبح کی نماز سے فراغت کے بعد میں باہر نکلا اور دیر تک کھلی فضا میں ٹہلتا رہا۔ کھلی فضا اور فطرت کے ماحول میں ٹہلنا میرا محبوب مشغلہ ہے۔ یہ میرے لیے خدا سے نفسیاتی قربت کا ایک لمحہ ہوتا ہے۔

مجھے یاد ہے کہ بچپن میں جب کہ میں یوپی کے ایک دور افتادہ گاؤں میں رہتا تھا۔ وہاں گاؤں کے کنارے ایک ندی تھی جس کے اوپر غالباً ۱۹۳۶ میں ایک پل بنایا گیا تھا۔ یہ پل جب بنا تو میں نے اس پر یہ شعر کہا تھا:

بحمد اللہ کہ ایں جسرِ عظیم الشاں مکمل شد   زسعی مولوی اقبال احمد خاں مکمل شُد

اس پل کے چاروں طرف دور تک درختوں اور کھیتوں کے مناظر تھے۔ میں جب گاؤں میں ہوتا تو میں روزانہ صبح اور شام جا کر اس پل کے اوپر بیٹھ جاتا اور دیر تک فطرت کے مناظر کو دیکھتا رہتا۔ ندی میں پانی کا بہنا، سرسبز مناظر، فضا میں اڑنے والی چڑیاں، صبح اور شام کا سورج، آسمان کی وسعت، میں دیر تک ان مناظر میں کھویا رہتا۔ یہ مشاہدہ میرے لیے ایک روحانی خوراک کے ہم معنی ہوتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اس روحانی سیر میں ہمیشہ میں اکیلا رہتا تھا۔ گاؤں کا کوئی دوسرا شخص میرے ساتھ نہیں ہوتا تھا۔ یہ پل گویا میرے لیے ایک فطری اسٹیج تھا جہاں سے میں خدا کے تخلیقی کرشموں کو دیکھ سکوں۔

جے پور کے مسٹر اسوتوش اپادھیائے ایک ہونہار طالب علم ہیں۔ اُنہوں نے ہندی میں ایک کویتا لکھی اور مجھ کو سنایا۔ پھر میرے کہنے پر انھوں نے اس کویتا کی ایک نقل مجھے دی۔ اُن کی یہ کویتا یہاں نقل کی جاتی ہے:

प्रेरणास्रोत ताऊजी को
‘बटवारा नहीं’ के विमोचन के अवसर पर सादर समर्पित:

है मेरा एक सपना, हो वही ’अपना हिन्दुस्तान’
जहाँ ज़ात–पात से किसी को न हो वास्ता।

जहाँ पढ़ें सभी मिलकर गीता और कुरान
राम और रहीम दोनों ही हों भगवान।
जहाँ न हो किसी को राजा और रंक का भान
बने वही 'दुनिया की शान'
हो वही 'अपना हिन्दुस्तान.....

ज्योति प्रेम—सद्भाव की लेकर
अपनी मंज़िल चुन्नी होगी।
बँटवारे की 'भूल' भुलाकर
नई कहानी लिखनी होगी।
चलना होगा साथ सभी को
करना होगा मानवता का आह्वान
तभी बनेगा फिर से वही 'अपना हिन्दुस्तान'

۱۹ ستمبر کو صبح کی چائے کے بعد دوبارہ ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا جو دوپہر بعد تک جاری رہا۔ بہت سے ہندو اور مسلمان ملاقات کے لیے آئے۔ ان میں سے مدرسہ جمعیۃ القریش کے چار اساتذہ بھی تھے جن کے نام یہ ہیں: مولانا بشیر احمد، مولانا محمد ہاشم رضا اشرفی، مولانا محمد ظہیر عالم، مولانا محمد منظور عالم۔ انھوں نے کہا کہ ہم لوگ ایک دینی مدرسے میں پڑھاتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ تم لوگ مسجد و مدرسے کا کام کرتے ہو اور اس دینی کام کا معاوضہ لیتے ہو۔ تم لوگ دین کو فروخت کر رہے ہو۔ انھوں نے کہا کہ اس پر ہم کو ندامت کا احساس رہتا ہے۔

میں نے کہا کہ جو لوگ ایسا کہتے ہیں بالکل غلط کہتے ہیں۔ آپ لوگ تعلیم دین کا معاوضہ نہیں لیتے بلکہ آپ لوگ اپنے وقت کا معاوضہ لیتے ہیں۔ اور یہ بلا شبہہ جائز ہے۔ میں نے کہا کہ دور اول میں دین کے خادم کے لیے معاوضہ لینے کی بھی مثال ہے اور معاوضہ نہ لینے کی بھی مثال ہے۔ خلیفۂ اول ابوبکر صدیق نے معاوضہ نہیں لیا اور خلیفۂ دوم عمر فاروق نے بقدر ضرورت معاوضہ لیا۔ اور بلاشبہہ دونوں اسلام میں یکساں طور پر معیاری نمونے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ایک صاحب نے کہا کہ علماء مدرسے اور مسجد کی خدمت کرتے ہیں۔ اس کام میں ان کو جو کچھ

دیا جاتا ہے اس سے ان کا خرچ پورا نہیں ہوتا۔ انھوں نے کہا کہ کچھ لوگوں کی رائے ہے کہ حکومت لوگوں کا مالی تعاون کرے۔ میں نے کہا کہ ہم کو مالی وسعت کے لیے حکومت کی طرف نہیں دیکھنا چاہیے بلکہ ہم کو خدا کی طرف دیکھنا چاہیے۔ قرآن میں آتا ہے کہ: الیس اللہ بکافٍ عبدہ (الزمر:۳۶)

میں نے کہا کہ خدا جب کسی انسان کو پیدا کرتا ہے تو اسی کے ساتھ وہ اس کو خاص صلاحیتیں بھی عطا کرتا ہے۔ ہم میں سے ہر شخص اپنی اس خداداد صلاحیت کو دریافت کرے۔ میں نے کہا کہ لوگوں کو کوئی ہنر سیکھنا چاہیے۔ کوئی نئی زبان سیکھنا چاہیے تاکہ ہم اپنے آپ کو نئی ضرورتوں کے مطابق بنا سکیں۔ محنت اور دیانت داری کے ساتھ کام کرنا چاہیے۔ اس سے لوگوں کے اندر نیا عزم اور نیا حوصلہ پیدا ہوگا اور ان کے تمام مسائل فطری طور پر حل ہو جائیں گے۔

کچھ مسلمان ملاقات کے لیے آئے۔ انھوں نے کہا کہ آج کل میڈیا کے اثر سے سارے مسلمانوں کو آتنک وادی سمجھا جانے لگا ہے۔ ہم مانتے ہیں کہ کچھ مسلمان آتنک واد میں لگے ہوئے ہیں۔ لیکن زیادہ مسلمان وہ ہیں جن کو ان چیزوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ وہ شانتی کے ساتھ اپنے کام دھندے میں لگے ہوئے ہیں۔ پھر سارے مسلمانوں کو کس لیے بدنام کیا جاتا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ بدنامی کی بات نہیں۔ یہ وہی بات ہے جو ہو رہی ہے۔ پھر میں نے کہا کہ اسلام میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ مجرم صرف وہی نہیں ہے جو خود جرم کر رہا ہے۔ بلکہ وہ بھی مجرم ہے جو جرم کرنے والوں کی مذمت نہ کرے۔ صرف الگ رہنا کسی کو بے قصور ثابت نہیں کرتا۔ اسلامی اصول کے مطابق، آپ صرف اس وقت اس سے الگ قرار پائیں گے جب کہ آپ اس کے خلاف منھ سے بول کر یہ ظاہر کریں کہ آپ اس میں شریک نہیں ہیں۔

اسلم شیر خان جیولر ملاقات کے لیے آئے۔ وہ ایک سنجیدہ آدمی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ شمیم جے پوری کا ایک شعر مجھے پسند ہے اور اس کو لکھ کر میں نے اپنے آفس میں لگایا ہے۔ وہ شعر یہ ہے:

یا مصلحت ہے کچھ کہ جو ملتا نہیں اسے　　یا پھر کمی ہے عجزِ عبادت گزار میں

ان سے میں نے پوچھا کہ بزنس میں کامیابی کا راز کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ بزنس میں

سب سے زیادہ ضروری ہے کہ جو کام آپ کر رہے ہیں اس میں آپ کو پوری سمجھ ہو۔ ہم جواہرات کا کام کرتے ہیں تو ہمیں پتھر کی پہچان ہونی چاہیے۔ ہم کو یہ جاننا چاہیے کہ کس طرح کی کوالٹی فائدہ مند ہوگی۔ ایک اور سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ مسلم مسائل کی جڑ مسلمانوں کا مزاج ہے۔ جب کوئی مسئلہ آتا ہے تو مسلمان فوراً تشدد شروع کر دیتے ہیں۔ اس کے بجائے امن واخلاق پر مبنی جو طریقہ ہے اس میں کامیابی یقینی ہے۔ ایک اور سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ ہمارے خاندان میں جب کوئی مسئلہ پیدا ہوتا ہے تو ہم اس کو ضبط ودرگذر اور اخلاق سے طے کرتے ہیں۔

مسٹر فیروز خاں ایک تجربے کار لیڈر ہیں۔ انھوں نے مسلم مسائل کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ مسلمانوں کا یہ مزاج بن گیا ہے کہ مسلمان کسی مسلمان کی زندگی میں اس کو لیڈر نہیں مانتا۔ البتہ مرنے کے بعد وہ اس کو لیڈر مان لیتا ہے۔ میں نے کہا کہ آج کل مسلمانوں کو عام طور پر یہ کہتے ہوئے سنا جاتا ہے کہ مسلمانوں کا کوئی لیڈر نہیں۔ یہ ایک بے بنیاد بات ہے۔ کہنے والوں کو یہ کہنا چاہیے کہ مسلمان کسی لیڈر کو نہیں مانتا۔ اس لیے اس کا کوئی لیڈر بھی نہیں۔ فطرت کی طرف سے ہر قوم میں لیڈر پیدا ہوتے ہیں لیکن کوئی شخص لیڈر شپ کا رول صرف اس وقت ادا کر سکتا ہے جب کہ لوگ اس کو اپنا لیڈر مان لیں۔ کوئی لیڈر دعویٰ کر کے لیڈر نہیں بنتا۔ بلکہ وہ لوگوں کی طرف سے قبولیت پانے کے بعد لیڈر بنتا ہے۔

ویمل اگروال اور مکیش آر ایس ایس کے ممبر تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آر ایس ایس کا مقصد کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ اس کا مقصد ہندوؤں کو سنگھٹت کرنا تھا۔ اس کے بانی ڈاکٹر کیشو بلی رام ہیڈگوار کا خیال تھا کہ ہندوؤں پر ظلم اسی لیے ہوتا ہے کہ ہندو سنگھٹت نہیں ہیں۔ آر ایس ایس کے کچھ لوگوں سے میں نے پوچھا کہ کہا جاتا ہے کہ آر ایس ایس کے لوگ مہاتما گاندھی کو پسند نہیں کرتے۔ انھوں نے کہا کہ ہاں۔ میں نے دوبارہ پوچھا کہ پسند نہ کرنے کا سبب کیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ آر ایس ایس کا یہ ماننا ہے کہ اگر گاندھی نہ چاہتے تو دیش کا بٹوارہ نہ ہوتا۔ میں نے کہا کہ اگر یہ بٹوارہ نہ ہوتا تو دوبارہ وہ آپ کی پسند کے خلاف ہوتا۔ میں نے کہا کہ اکھنڈ بھارت میں انڈیا، پاکستان، کشمیر، بنگلہ دیش سب ایک ہوتے۔ اس طرح اکھنڈ بھارت میں مسلمان تقریباً میجارٹی

میں ہوجاتے۔ پھر آپ اکھنڈ بھارت میں اپنا ہندوایجنڈا کیسے چلاتے۔ اس کا انھوں نے کوئی واضح جواب نہیں دیا۔

۱۹ دسمبر کو جے پور کی سڑکوں پر چلتے ہوئے ایک بینر دکھائی دیا۔ یہ جماعت اسلامی راجستھان کی طرف سے تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ جماعت اسلامی آج کل حقوق انسانی کی مہم چلارہی ہے اور یہاں اس موضوع پر اس کی کانفرنس ہونے والی ہے۔ مجھے یاد آیا کہ ۱۹۵۰ کے زمانے میں، میں اعظم گڑھ میں تھا۔ اس وقت ہر ماہ ایک ضلعی اجتماع ہوا کرتا تھا۔ ان ضلعی اجتماعات میں اکثر مولانا صدرالدین اصلاحی کی تقریر ہوتی تھی۔ ایک تقریر میں انھوں نے کہا کہ اس دنیا میں مومن کی صرف ذمے داریاں ہیں۔ اس دنیا میں مومن کا کوئی حق نہیں۔ میں بھی اس اجتماع میں موجود تھا۔ یہ ابتدائی زمانہ کی بات ہے جب کہ جماعت اسلامی کی تحریک ایک فعّال تحریک کی حیثیت رکھتی تھی۔ اب جب کہ جماعت اسلامی ایک بے روح ڈھانچہ بن چکی ہے تو اب اس کی بولی بھی بدل گئی ہے۔ جاننے والے اسے جانتے ہیں کہ حقوق انسانی (human right) کی تحریک چلانا صرف ایک سستی لیڈری ہے۔ کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ فرائض انسانی (human duties) کی تحریک چلائی جائے۔ سماج کو فرض شناس (duty conscious) بنایا جائے۔ حقوق شناس (right conscious) سماج میں صرف جنگ کلچر وجود میں آتا ہے نہ کہ ذمے دارانہ کلچر۔

تحریکیں دوقسم کی ہوتی ہیں ایک وہ جو ابدی اصول کی بنیاد پر چلائی جائے، دوسرے وہ جو لوگوں کے اندر چھپے ہوئے جذبات کی بنیاد پر چلائی جائے۔ نتیجہ خیز تحریک صرف پہلی قسم کی تحریک ہے۔ دوسری قسم کی تحریک سے کبھی کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہیں ہوتا۔ اصول کی بنیاد پر تحریک چلانا بے حد مشکل کام ہے۔ اس میں لمبی مدت تک بظاہر کوئی نتیجہ نکلتا ہوا نظر نہیں آتا۔ اس کے برعکس، دوسری قسم کی تحریک عوامی جذبات کو غذا دینے والی ہوتی ہے۔ اس لیے اس کے اردگرد بہت جلد بھیڑ اکھٹا ہوجاتی ہے۔ اسلامی تحریک احتسابِ خویش کی بنیاد پر اٹھتی ہے اور غیر اسلامی تحریک احتسابِ غیر کی بنیاد پر۔

۱۰ دسمبر ۱۹۴۸ کو اقوام متحدہ کے تحت یونیورسٹی ڈیکلریشن آف ہیومن رائٹس کے منشور پر تمام

قوموں کے نمائندوں نے دستخط کیے تھے۔ اسی نسبت سے ہر سال ۱۰ دسمبر کو، حقوق انسانی کے دن کے طور پر منایا جاتا ہے۔ ۲۰۰۴ میں اس موقع پر جماعت اسلامی نے حقوق انسانی کا ہفتہ منایا۔ ملک میں مختلف مقامات پر جلسے کیے۔ آخر میں پانچ نکاتی قرارداد منظور کی گئی۔ وہ قرارداد یہ تھی:

۱۔ (الف) جو افراد اور گروہ فسادات کے اور انسانوں کے قتلِ عام کے مجرم ہوں، ان کو ملکی قانون کے تحت سخت سزا دی جائے، تاکہ ان کی حوصلہ شکنی ہو اور ملک میں امن وامان بحال ہو سکے۔ (ب) محکمۂ پولیس میں شہریوں کے مختلف طبقات کو متناسب نمائندگی دی جائے اور فرضی مدبھیڑ، زیرِ حراست اموات اور ملزموں کی تعذیب کے ہر واقعے کے ذمے دار پولیس اہل کاروں کو سخت سزا دی جائے۔ (د) کشمیر میں انسانی حقوق کی پامالی کو روکا جائے اور انسانی حقوق کی خلاف ورزی کرنے والے عملے کو سخت سزا دی جائے۔

۲۔ یہ جلسہ حکومتِ ہند کو توجہ دلاتا ہے کہ انصاف کرنا حکومت کی بنیادی ذمہ داری ہے۔ یہ اجلاس مطالبہ کرتا ہے کہ انصاف کر کے اس کی رفتار تیز کی جائے، نیز جن افراد پر مقدمے چل رہے ہیں اور وہ پانچ سال سے زائد عرصہ جیل میں کاٹ چکے ہیں، انھیں رہا کیا جائے۔

۳۔ یہ جلسہ مطالبہ کرتا ہے کہ پوٹا کے تمام قیدیوں کو رہا کیا جائے اور unlawful activities act میں جو اضافے کیے گیے ہیں، انھیں واپس لیا جائے نیز پوٹا کا مزید استعمال بند کیا جائے۔ یہ جلسہ مطالبہ کرتا ہے کہ ایس آئی ایم پر لگی ناروا پابندی اٹھائی جائے اور تمام مقدمات واپس لیے جائیں۔

۴۔ یہ جلسہ، عراق کے مظلوم عوام کے ساتھ اپنی ہم دردی اور یک جہتی کا اظہار کرتا ہے اور اپنے اس اعتماد کا اظہار کرتا ہے کہ اپنے ملک کی آزادی کے لیے ان کی جدوجہد اللہ کی نصرت وتائید سے بالآخر ان شاء اللہ کامیاب ہوگی۔ یہ اجلاس بین اقوامی فورموں سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ امریکا کا عراق سے تسلط ختم کرنے کے لیے اپنے اثرات کا استعمال کریں۔ یہ اجلاس حکومت ہند سے مطالبہ کرتا ہے کہ عراق کے عوام کو آزادی دلانے کے لیے اپنے اثر ورسوخ کا استعمال کرے۔

۵۔ یہ جلسہ، شرکاءِ اجلاس کے اس عہد اور عزم کا اظہار کرتا ہے کہ وہ خود کسی پر ظلم نہیں کریں گے،

ظلم کو برداشت نہیں کریں گے، ظلم کے خلاف آواز اٹھائیں گے اور مظلوموں کی حمایت کریں گے۔
(ماہنامہ: اللہ کی پکار، جنوری ۲۰۰۵، صفحہ ۱۰۷)

جماعت اسلامی نے اپنا ہفتہ حقوق انسانی کے نام پر منایا تھا۔ مگر اس میں جو تجویزیں پاس کی گئیں وہ حقوق مسلم سے تعلق رکھتی ہیں، نہ کہ حقوق انسانی سے۔ اس تضاد میں موجودہ زمانے کے تقریباً تمام مسلم رہنما مبتلا ہیں۔ حقوق کے نام سے وہ صرف مسلم حقوق کو جانتے ہیں۔ یہ سوچ اتنا زیادہ غالب ہے کہ اگر کوئی حقوق انسانی کا نام لیتا ہے تو عملاً اس کی مراد اس سے حقوقِ مسلم ہوتی ہے۔ موجودہ زمانے کے مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ انسانیتِ عامہ ان کا کنسرن (concern) نہیں۔ ان کے نزدیک احترام سے مراد احترام مسلم ہوتا ہے۔ وہ حقوق کے نام سے حقوق مسلم کو جانتے ہیں۔ ان کی تقریریں اور تحریریں مسلمانوں کے خلاف ظلم سے بھری ہوتی ہیں۔ لیکن خود مسلمان دوسروں کے خلاف جو ظلم کرتے ہیں اس سے ان کی تقریریں اور تحریریں خالی ہوتی ہیں۔ قرآن کی زبان میں وہ ''تطفیف'' ہے۔ یعنی اپنی رعایت تو خوب جاننا مگر دوسروں کی رعایت سے بے خبر رہنا۔

کچھ نوجوانوں کو نصیحت کرتے ہوئے میں نے کہا کہ انسان کی سب سے بڑی طاقت یہ ہے کہ اس کے دل میں سب کے لیے پیار ہو۔ کامیابی یقینی ہے بشرطیہ کہ آپ صبر کے ساتھ جدو جہد کر سکیں۔

ایک مسلمان نے کہا کہ ہم لوگوں کی عورتیں گھروں میں رہتی ہیں وہ باہر جا کر کوئی کام نہیں کر سکتیں۔ کیا اسلام کا حکم یہی ہے۔ میں نے کہا کہ اسلام میں صحابہ کو ماڈل کا درجہ دیا گیا ہے۔ اور صحابہ کی خواتین گھر کے باہر نکلتی تھیں اور باہر کے کام کرتی تھیں۔ یہی صحیح اسلامی نمونہ ہے۔ عورتوں کو ضروری حدود کے اندر رہتے ہوئے ہر وہ کام کرنا چاہیے جو شریعت میں جائز ہے۔ پردے کے سلسلے میں نے کہا کہ فقہاء نے عورت کو وَجہ، کَفَّین اور قَدَمین کے کھولنے کی اجازت دی ہے۔ عورتوں کو سادہ اور ڈھیلا کپڑا پہننا چاہیے۔ ان کو بناؤ سنگار سے بچنا چاہیے۔ وہ ہر ضروری اور جائز کام باہر جا کر کر سکتی ہیں۔

فاروق احمد خاں آئی ایس افسر ملاقات کے لیے آئے۔ انھوں نے کہا کہ آتنک واد اب ایک انڈسٹری بن چکا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ کا کہنا درست ہے مگر کون سی چیز ہے جو انڈسٹری نہ

ہو۔ تاہم یہ ایک ناقابل معافی جرم ہے کہ ایک غیر اسلامی کام کو اسلام کے نام پر کیا جائے۔ مثلاً مادی اور قومی لڑائی چھیڑی جائے اور اس کو جہاد فی سبیل اللہ بتایا جائے۔

اس سفر میں مجھے ایک ذاتی تجربہ اس چیز کا ہوا جس کو ثنائی طرز فکر (dichotomous thinking) کہا جاتا ہے۔ یعنی چیزوں کو بلیک اینڈ وائٹ (black & white) میں دیکھنا اور تیسرے انتخاب (third option) سے بے خبر رہنا۔ جے پور کے اس سفر کے دوسرے دن (۱۹ دسمبر) کو اتوار تھا۔ ہمارے دہلی کے ساتھیوں کا اصرار تھا کہ میں اتوار کو دوپہر تک دہلی واپس آجاؤں تاکہ اتوار کی کلاس حسب معمول ہو سکے۔ مگر اس وقت میرے ذہن میں صرف دو صورتیں تھیں۔ ایک ہوائی جہاز کا سفر اور دوسرے ٹرین کا سفر۔ ہوائی جہاز سے جانے میں دہلی ائر پورٹ کی کہر (fog) کا مسئلہ تھا۔ اور ٹرین سے جانے کی صورت میں یہ مسئلہ تھا کہ واپسی میں ٹرین تاخیر سے شام کو دہلی پہنچتی تھی۔ میرے ذہن میں اس وقت صرف دو ہی صورتیں تھیں۔ یا دونوں طرف جہاز سے جانا یا دونوں طرف ٹرین سے سفر کرنا۔ بعد کو سمجھ میں آیا کہ یہاں ایک تیسری صورت بھی تھی اور اس کو اختیار کرنے کی صورت میں باسانی یہ ممکن تھا کہ میں اتوار کو دوپہر تک دہلی واپس آجاؤں اور معمول کے مطابق کلاس کر سکوں۔ تیسری صورت یہ تھی — دہلی سے ۱۸ ستمبر کی صبح کو ٹرین سے جے پور جانا، اور ۱۹ ستمبر کی صبح کو جہاز کے ذریعے دہلی واپس آنا۔ مگر یہ تیسری صورت اس وقت میرے ذہن میں نہ آسکی۔

مکیش مینا راجستھانی نے بتایا کہ راجستھانی کلچر یہ ہے کہ ہمارے یہاں مہمان آجاتا ہے تو ایسا لگتا ہے کہ جیسے ہمارے پاس بھگوان آگیا ہے۔ مجھے اپنے اس سفر میں اس کا ذاتی تجربہ ہوا۔ یہاں کے لوگوں کی طرف سے جس عزت اور حسن سلوک کا تجربہ ہوا وہ بہت غیر معمولی تھا۔ مکیش مینا سے گفتگو کے بعد معلوم ہوا کہ یہ اسی ریگستانی ریاست کا کلچر ہے جو اس سفر کے دوران میرے حصے میں آیا۔ میں نے غور کیا کہ راجستھان میں اس قدیم کلچر کا سبب کیا ہے۔ میں نے سوچا تو یاد آیا کہ میرے بچپن میں خود میرے گاؤں میں یہ کلچر موجود تھا۔ مگر اب اختلافات کے نتیجے میں یہ کلچر ٹوٹ چکا ہے۔ غالباً راجستھان میں ایسا ہوا کہ یہ ریاست چونکہ ایک ریگستانی ریاست تھی۔ یہاں پانی کی کمی تھی۔ اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا

کہ یہاں صنعتیں قائم نہ ہوسکیں۔ چنانچہ راجستھان میں باہر کے لوگ نہیں آئے۔ جو کچھ ہوا وہ صرف یہ کہ یہاں کے کچھ لوگ باہر چلے گیے۔ اس واقعے کی بنا پر ایسا ہوا کہ راجستھان کا روایتی کلچر اپنی قدیم حالت میں محفوظ رہا۔

۱۹ ستمبر کی شام کو جے پور سے دہلی واپسی تھی۔ ساتھیوں کے ہمراہ ہوٹل سے روانہ ہوا۔ مشورے کے مطابق یہ طے ہوا کہ اسٹیشن جاتے ہوئے راستہ بدل کر سفر کیا جائے اور جے پور کے مختلف اہم مقامات کو دیکھتے ہوئے اسٹیشن پہنچیں۔ اس طرح جے پور کے اہم اور تاریخی مقامات پر ایک نظر ڈالنے کا موقع ملا۔ جے پور ایک خوبصورت شہر ہے۔ یہاں سیاح کافی تعداد میں آتے ہیں۔ جے پور کو خوبصورت بنانے میں سر مرزا اسماعیل کا بہت بڑا دخل ہے۔ ۱۹۴۷ سے پہلے وہ جے پور کے ایڈمنسٹریٹر تھے۔ سر مرزا اسماعیل اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے اور اسی کے ساتھ انتظام اور منصوبہ بندی کی ان کے اندر غیر معمولی صلاحیت تھی۔ سر مرزا اسماعیل کی یہ صلاحیت جے پور کی شہری تعمیر میں بہت کام آئی۔ انھوں نے اس شہر کو ہر اعتبار سے ایک خوبصورت شہر بنادیا۔ جے پور کی خوبصورتی کی ایک جھلک میں نے واپسی کے سفر میں دیکھی۔ جے پور راجستھان کی راجدھانی ہے۔ جے پور میں مختلف قسم کی صنعتیں ہیں۔ جویلری یہاں کی مشہور صنعت ہے۔ اس صنعت سے یہاں کے باشندوں کی بڑی تعداد جڑی ہوئی ہے۔ جے پور ایک باحصار شہر (walled city) ہے۔ یہ قدیم دیوار اب بھی موجود ہے۔ البتہ اس کے باہر نیا جے پور دور تک آباد ہوگیا ہے۔

جے پور کی بنیاد ۱۷۲۷ میں ڈالی گئی۔ اس سے پہلے انبر یہاں کی راجدھانی تھا۔ جے پور پنک سٹی (Pink City) کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں اکثر سیدھی سڑکیں بنائی گئی ہیں۔ راج کا محل اب بھی یہاں کی خاص عمارتوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ دوسری کچھ خاص عمارتیں یہ ہیں: ہوا محل، رام باغ پیلیس، نہر گڑھ، ٹائیگر فورٹ اور میوزیم، وغیرہ۔ راجستھان یونیورسٹی بہت بڑی یونیورسٹی ہے۔ وہ ۱۹۴۷ میں قائم کی گئی۔ جے پور شہر کے اہم مقامات کو دیکھتے ہوئے ریلوے اسٹیشن پہنچا۔ اسٹیشن صاف ستھرا نظر آیا۔ جو لوگ مجھے پہنچانے کے لیے آئے تھے ان سے

دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ ٹرین تقریباً آدھ گھنٹہ لیٹ ہو کر پلیٹ فارم پر آئی۔ اس تاخیر کا راز بعد کو معلوم ہوا۔ ریزرویشن کے مطابق، میں اپنے کوچ میں داخل ہو گیا۔ ایگزیکٹیو کلاس میں آج خلاف معمول زیادہ مسافر نظر آئے۔ ٹرین روانہ ہوئی تو اندازہ ہوا کہ اس میں کئی مسلم افراد سفر کر رہے تھے۔ بعد کو معلوم ہوا کہ یہ پاکستان کی پارلیمنٹ کے سترہ ممبران تھے جو لوک سبھا کے اسپیکر کی دعوت پر دہلی آئے تھے۔ یہ لوگ آج صبح اجمیر گیے تھے تاکہ وہ لوگ وہاں خواجہ معین الدین چشتی کی درگاہ کی زیارت کر سکیں۔ وہاں سے فارغ ہو کر اب یہ لوگ دوبارہ دہلی جا رہے تھے۔

معلوم ہوا کہ ان میں سے کئی ممبران مجھ سے واقف تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو میری کتابیں پڑھے ہوئے تھے۔ ایک صاحب نے میرے پاس آ کر سنجیدہ انداز میں کہا: ”میری چھ بیٹیاں ہیں۔ ایک کی شادی ہو چکی ہے۔ آپ دعا فرمائیں کہ باقی کا بھی اچھا رشتہ ہو جائے۔ خواجہ غریب نواز کے یہاں میں نے اپنی درخواست لگا دی ہے“ معلوم ہوا کہ ان لوگوں کا لنچ حکومت کی طرف سے اجمیر میں رکھا گیا تھا۔ لنچ سے فارغ ہونے میں کچھ دیر ہو گئی اس لیے ٹرین کو لیٹ کر دیا گیا۔

میرے ساتھ کچھ پرچے تھے۔ راستے میں ان کو پڑھوا کر سنا۔ انگریزی ہفت روزہ ریڈئنس (۱۹-۲۵ دسمبر ۲۰۰۴) میں ایک تفصیلی مضمون شامل تھا۔ اس کا عنوان یہ تھا:

Islamic Resurgence in 21st cetury:
Prospects and Challenges.

اس مضمون میں تفصیل سے بتایا گیا تھا کہ اسلام بہت تیزی سے ساری دنیا میں پھیل رہا ہے۔ لوگ بڑی تعداد میں اسلام قبول کر رہے ہیں۔ مضمون نگار نے اس سلسلے میں مختلف حوالے دیے تھے۔ انھوں نے لکھا تھا کہ آج دنیا کے ہر چار آدمی میں سے ایک مسلمان ہے۔ مغربی جرائد سے نقل کیے ہوئے چند جملے یہ تھے:

Islam is the fastest growing religion in the world.

The religion of Islam is growing faster than any other religion in the world.

100000 people per year in America alone are converting to Islam.

ساری دنیا میں اسلام کی تیز رفتار اشاعت کی بات بالکل درست ہے۔ مگر مضمون نگار نے اس واقعے کا جو سبب بتایا تھا وہ درست نہ تھا۔ انھوں نے لکھا تھا کہ بیسویں صدی میں مسلم دنیا میں کچھ مفکر پیدا ہوئے۔ مثلاً علامہ اقبال، سید مودودی، حسن البناء، سید قطب وغیرہ۔ ان صاحبان کا لٹریچر مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو کر چھپا اور وہ جنگ کی آگ کی طرح ہر جگہ پھیل گیا:

This literature is being vigorously translated into various languages of the world and is spreading like wild fire.

مضمون میں یہ خیال ظاہر کیا گیا تھا کہ یہ مسلم مفکرین کا لٹریچر ہے جس کی وجہ سے اسلام دنیا میں پھیل رہا ہے۔ یہ بات خلافِ واقعہ ہے۔ مذکورہ لٹریچر تمام تر مسلمانوں کے لیے لکھا گیا۔ وہ صرف مسلم ذہن کو مخاطب کرتا تھا۔ وہ نہ غیر مسلموں کے لیے لکھا گیا اور نہ وہ غیر مسلم ذہن کو ایڈریس کرتا تھا۔ یہ لٹریچر صرف مسلمانوں میں پڑھا گیا۔ ایسی حالت میں اس کا کوئی سوال ہی نہیں کہ ان حضرات کے لٹریچر کی وجہ سے یہ غیر مسلم اسلام میں داخل ہو رہے ہیں۔ ان نومسلموں کا مطالعہ بتاتا ہے کہ یہ وہ لوگ تھے جو اپنے مذہب سے غیر مطمئن تھے۔ انھیں سچائی کی تلاش تھی۔ پھر انھوں نے قرآن کو پڑھا۔ قرآن نے ان کی فطرت کو مطمئن کیا اور وہ اسلام میں داخل ہو گیے۔ کسی نے اپنے جذبۂ تلاش کے تحت بطور خود انٹرنیٹ سے یا کسی اور ذریعے سے معلومات حاصل کیں اور پھر اسلام قبول کر لیا۔

اسلام کی اشاعت کے لیے دعوت پر مبنی لٹریچر درکار تھا۔ مگر مذکورہ حضرات کی لٹریچر میں دعوت کا کوئی تصور ہی موجود نہ تھا۔ ان تمام حضرات کا لٹریچر جہاد اور سیاست پر مبنی لٹریچر تھا۔ اس نے مسلمانوں کے اندر یہ جذبہ پیدا کیا کہ وہ مسلمانوں کی سیاسی عظمت کو واپس لائیں۔ چنانچہ اس ''انقلابی لٹریچر'' سے متاثر ہونے والے مسلمان جہاد میں اور سیاسی سرگرمیوں میں مشغول ہو گیے۔ اس انقلابی لٹریچر کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ساری دنیا کے مسلمان یا تو مسلح جہاد میں مشغول ہیں یا وہ ان کی تائید کرتے ہیں۔ اس لٹریچر کا یہ نقصان ہوا ہے کہ موجودہ زمانے کے مسلمانوں میں ہر جگہ سیاسی طرز فکر غالب آ گیا۔ دعوتی طرز فکر ان کے اندر پیدا ہی نہ ہو سکا جو اسلام کی اشاعت کے لیے ضروری ہے۔

جے پور میں ایک بڑا مدرسہ ہے جس کا نام جامعۃ الہدایۃ ہے۔ اس مدرسے کی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے قدیم علوم کے ساتھ جدید علوم کو اپنے نصاب میں شامل کیا ہے۔ اس نقشے پر وہ کامیابی کے ساتھ چلایا جارہا ہے۔ اس ادارے کی طرف سے ایک ماہنامہ نکلتا ہے جس کا نام ہدایت ہے۔ اس کا شمارہ (نومبر۔ دسمبر ۲۰۰۴) دیکھنے کا موقع ملا۔ اس میں ایک مضمون اس عنوان کے تحت چھپا تھا: سادگی مسلم کی دیکھ اوروں کی عیّاری بھی دیکھ۔ صاحب مضمون نے جو باتیں لکھی تھیں ان میں سے ایک یہ تھی:

''تیونس کے صدر زین العابدین بن علی وہائٹ ہاؤس کے دورے سے واپس آئے۔ اس کے بعد تیونس میں منعقد ہونے والی عرب چوٹی کانفرنس (۲۲۔ ۲۳ مئی ۲۰۰۴) میں تیونس کے صدر نے سارے عربوں سے اپیل کی کہ وہ کانفرنس کے پلیٹ فارم سے شہات پسندی کی کارروائی کی مذمت کریں'' (صفحہ ۲۵)

صاحب مضمون نے تیونس کے صدر کی اس تجویز کی سخت مذمت کی تھی۔ اور اس کو اسرائیل کے حق میں ایک مؤیدانہ کوشش قرار دیا تھا۔ انھوں نے اس تجویز کو نفرت اور حقارت کے ساتھ ٹھکرادیا۔ تیونس کے صدر نے اپنی تجویز میں جس چیز کی مذمت کی تھی وہ خودکش بمباری (sucide bombing) تھی۔ مگر اس کو مضمون میں شہادت طلبی کا نام دیا گیا ہے۔ عرب علماء اس کو استشہاد کہتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ عین وہی چیز ہے جس کو تحلیل الحرام کہا گیا ہے۔ یعنی ایک حرام فعل کو خوبصورت نام دے کر اس کو حلال بتانا۔ میرے نزدیک یہ دہرا جرم ہے۔ ایک یہ کہ خودکشی کا حرام فعل کرنا اور دوسرے اس حرام فعل کو استشہاد اور شہادت طلبی کا نام دینا۔ یہ بلاشبہہ کسی قوم کے زوال کی آخری علامت ہے۔

ماہنامہ میثاق (دسمبر ۲۰۰۴) میں ایک مضمون چھپا ہوا تھا۔ اس میں بتایا گیا تھا کہ اقامت دین کی جدوجہد فرض عین ہے (صفحہ ۸۷) موجودہ زمانے کے کچھ مسلم مفکرین بار بار یہ بات کہتے رہے ہیں مگر اس میں ایک شدید مغالطہ پایا جاتا ہے۔ یہ بات صحیح ہے کہ سورہ الشوریٰ کی آیت نمبر ۱۳ کے مطابق، الدین کی اقامت فرض عین ہے۔ مگر یہاں دین کی اقات سے مراد غیر سیاسی دین کی اقامت ہے نہ کہ سیاسی دین کا جھنڈا بلند کرنا۔ ان انقلابی مفکرین نے یہ ناقابل معافی جسارت کی ہے

کہ انھوں نے قرآن سے اقامت دین کا لفظ لیا اور اس کو خود ساختہ طور پر اقامت سیاست کے ہم معنیٰ بنا دیا اور پھر دعویٰ کیا کہ اس قرآنی آیت کے مطابق، سیاسی نظام کی اقامت فرض عین ہے۔ یہ بلاشبہہ عین وہی گمراہی ہے جس کو قرآن میں **یحرّفون الکلم عن مواضعہ** (النساء:۴۶) کہا گیا ہے۔ یعنی کلام کو اس کے موقع ومحل سے پھیر دینا، کسی بات کی غلط تشریح کرکے اس سے اپنا خود ساختہ مفہوم نکالنا۔

قرآن میں **اقیموا الدین** (الشوریٰ:۱۳) سے مراد واضح طور پر غیر سیاسی احکام کی اقامت ہے۔ کلام کے سیاق کی بنا پر تمام مفسرین نے لکھا ہے کہ یہاں اقامت دین سے مراد ان احکام الٰہی کی کامل پیروی ہے جو ایک فرد سے ہر حال میں مطلوب ہوتے ہیں۔ گویا اِس آیت میں اقامت سے مراد انفرادی احکام کی اطاعت ہے۔ جہاں تک اجتماعی اور سیاسی احکام کا تعلق ہے وہ اس آیت میں مذکور نہیں۔ کلام کے سیاق وسباق سے یہی ثابت ہوتا ہے اور یہی بلا استثناء تمام مفسرین کی رائے ہے۔

۱۹ دسمبر ۲۰۰۴ کی شام کو میں دہلی پہنچا۔ شتابدی ایکسپریس جے پور میں آدھ گھنٹے لیٹ تھی۔ مگر راستے میں اُس نے میک اپ کیا اور دہلی کے ریلوے اسٹیشن پر تقریباً اپنے ٹھیک وقت پر پہنچی۔ میں نے سوچا کہ اس میں بھی ایک سبق ہے۔ آدمی اگر اپنی زندگی کے سفر کا آغاز کرنے میں دیر کر دے تو اس میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ خدا نے اپنی دنیا میں ایسے امکانات رکھے ہیں جن کو استعمال کرکے آدمی منزل پر ٹھیک وقت پر پہنچ سکے۔ آغازِ سفر میں کمی کی تلافی وہ تکمیلِ سفر کے وقت کر لے۔ زندگی میں اصل اہمیت خاتمے کی ہے، نہ کہ آغاز کی۔

حدیث میں آیا ہے: **وإنما الأعمال بالخواتیم** (البخاری، کتاب القدر) یعنی اعتبار خاتمے کا ہے۔ یہ روایت ایک مخصوص واقعے کے پس منظر میں آئی ہے۔ مگر اس کا ایک عمومی پہلو بھی ہے۔ اور وہ وہی ہے جس کا اوپر ذکر ہوا۔ کسی بھی معاملے میں اصل دیکھنے کی چیز اس کا آغاز نہیں ہے بلکہ اس کا اختتام ہے۔ یہ دراصل اختتام ہے جو یہ بتاتا ہے کہ عمل درست تھا یا وہ درست نہ تھا۔

سوال

صحیح البخاری، کتاب الفتن میں یہ روایت آئی ہے: **مَن رأى من أميره شيئا يكرهه فليصبر عليه، فإنه من فارق الجماعة شبراً فمات إلاّ مات ميتة جاهلية** (فتح الباری، جلد ۱۳، صفحہ ۷) یعنی جو شخص اپنے امیر میں کوئی ایسی چیز دیکھے جو اس کو ناگوار ہو تو وہ اس پر صبر کرے۔ کیوں کہ جو شخص جماعت کو ایک بالشت کے برابر بھی چھوڑے اور اسی حال میں مرجائے تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہوگی۔ ایک دوسری روایت (صحیح مسلم، کتاب الامارۃ) میں یہ حدیث الفاظ کے تھوڑے فرق کے ساتھ آئی ہے۔ جس میں ''**جماعة**'' کے بجائے ''**بيعة**'' کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس حدیث کو لے کر مسلمانوں میں کئی جماعتیں بنائی گئیں۔ مثلاً جماعتِ اسلامی اور الاخوان المسلمون وغیرہ۔ ان بانیانِ جماعت نے کہا کہ جماعتی زندگی لازمی طور پر ضروری ہے۔ انھوں نے یا تاثر دیا کہ لوگ یا تو ہماری جماعت میں شامل ہوجائیں یا کوئی اور جماعت بنا کر اس کے تحت جماعتی زندگی گذاریں۔ جو لوگ ایسا نہ کریں، ان کا وہ انجام ہوگا جو حدیث میں ان الفاظ میں آیا ہے: **مَن شذّ شُذّ اِلَى النّار** (الترمذی، کتاب الفتن) یعنی جو شخص جماعت سے الگ ہوا وہ آگ میں جائے گا۔ اس سلسلے میں آپ کی کیا رائے ہے (محمد ذکوان ندوی، نئی دہلی)

جواب

حدیث کی یہ تشریح سخت گمراہ کُن ہے۔ اس حدیث میں جس بیعت کا ذکر ہے وہ بیعتِ جماعتی نہیں بلکہ وہ بیعتِ سیاسی ہے۔ حدیث کا یہ مفہوم بخاری کی دوسری روایت سے واضح ہو رہا ہے۔ دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں: **مَن كره من أميره شيئاً فليصبر، فإنّه مَن خرج من السّلطان شبراً، مات ميتة جاهلية** (فتح الباری، جلد ۱۳، صفحہ ۷) یعنی جس کو اپنے امیر کی کوئی چیز ناگوار ہو تو وہ صبر کرے۔ کیوں کہ جو شخص سلطان سے ایک بالشت بھی دور ہوا وہ جاہلیت کی موت مرے گا۔

دوسری روایت کے الفاظ سے واضح ہو رہا ہے کہ ان روایتوں میں التزامِ جماعت یا بیعتِ جماعت سے مُراد سیاسی التزام یا سیاسی بیعت ہے نہ کہ جماعتی التزام یا جماعتی بیعت۔ جن لوگوں نے جماعت بنا کر اس سے وابستگی کو نجات کا ذریعہ بتایا، انھوں نے یہ غلطی کی کہ اُس روایت کو لے لیا جس میں

جماعت کا لفظ آیا ہے، اور اس روایت کو چھوڑ دیا جس میں سلطان کا لفظ آیا ہے۔

اس قسم کی حدیثوں کا تعلق دورِ فتنہ سے ہے۔ یعنی ایسے زمانے سے جب کہ لوگ سیاسی حاکم کو لے کر اختلاف کی باتیں کریں اور حاکم کی اطاعت پر راضی نہ ہوں۔ ایسے موقع کے لیے مختلف حدیثوں میں جو بات آئی ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک حاکم کی حکومت جب قائم ہو جائے تو امّت کے ہر فرد کو اس کی اطاعت کرنا چاہیے۔ سیاسی شکایتوں کو لے کر اس کے خلاف خروج جائز نہیں۔ سیاسی حکمراں سے خروج کی یہ حُرمت کوئی حرمتِ اعتقادی نہیں ہے، بلکہ وہ حرمتِ سیاسی ہے۔ جب ایک حاکم کی حکومت قائم ہو جائے اور اجتماعی معاملات میں اس کا کنٹرول ہو جائے تو ایسے وقت میں اس سے خروج کرنا، نتیجے کے اعتبار سے صرف کاؤنٹر پروڈکٹیو (counterproductive) ثابت ہوگا۔

حدیث کے مطابق، ایسے حالات میں کسی شخص کے لیے جو انتخاب ہے وہ صرف دو میں سے ایک کا ہے۔ یا تو وہ صورت حال پر صبر کرے یا وہ مکمل طور پر پُر امن رہتے ہوئے خیر خواہانہ نصیحت کا طریقہ اختیار کرے۔ ان دو کے علاوہ تیسرا انتخاب لینا، یعنی اصلاحِ سیاست کے نام پر وقت کے حکمراں سے ٹکرانا، اسلام میں سراسر حرام ہے۔ حدیث کے اس مفہوم کی روشنی میں دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ سیاسی جماعت بنانے والوں نے یہ سنگین غلطی کی کہ جس فعل سے پیغمبر نے منع کیا تھا اس کو جائز کرنے کے لیے ایک اور ممنوع فعل کا ارتکاب کرلیا۔ یہ ممنوعیت نتیجے کے اعتبار سے تھی۔ چنانچہ واقعات بتاتے ہیں کہ ان نام نہاد اسلام پسندوں نے جن ملکوں میں اسلامائزیشن کی تحریک چلائی وہ عملاً ڈی اسلامائزیشن کے ہم معنٰی بن گئی۔

سوال

حدیث (**علیکم بالسّواد الأعظم**، مسند احمد، ۲۷۸/۴) کو لے کر یہ کہا جاتا ہے کہ سوادِ اعظم ہمیشہ حق پر ہوتا ہے۔ اس لیے آدمی کو سوادِ اعظم کا اتباع کرنا چاہیے۔ آپ اِس کی وضاحت کریں (محمد ذکوان ندوی)

جواب

اس حدیث میں سوادِ اعظم سے مراد اکثریت ہے۔ یعنی اکثریت کا ساتھ دو۔ یہ ساتھ دینا بطور

عقیدہ نہیں، بلکہ وہ عملی ضرورت کے طور پر ہے۔ جب کسی معاملے میں مسلمانوں کی اکثریت ایک طرف ہوجائے تو اُس وقت ایسا کرنا درست نہیں کہ آدمی حق اور ناحق کی بحث چھیڑ کر لوگوں کو اس کے خلاف بھڑکائے اور اکثریت سے جُدا ہوجائے۔ اجتماعی معاملات میں یہ نہیں دیکھنا چاہیے کہ آئڈیل ازم کے مطابق، کیا درست ہے اور کیا درست نہیں۔ بلکہ اس کے بجائے یہ دیکھنا چاہیے کہ عملی طور پر کیا ممکن ہے اور کیا ممکن نہیں۔ ایسے موقع پر آدمی کو پریکٹکل بن جانا چاہیے نہ کہ آئڈیلسٹ۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ سوادِ اعظم ہمیشہ حق پر ہوتا ہے اس لیے اس کا ساتھ دینے کا حکم دیا گیا۔ یہ ایک خلافِ واقعہ بات ہے، ایسا سمجھنا درست نہیں۔ اجتماعی معاملات میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک حکم بیان کیا جاتا ہے مگر وہ حکم عقیدے کی بنا پر نہیں ہوتا بلکہ وہ عملی ضرورت کی بنا پر ہوتا ہے۔ یہی معاملہ **علیکم بالسواد الأعظم** کا ہے۔ یہ حکم عملی مصلحت کی بنا پر دیا گیا ہے نہ کہ اعتقادی مسئلے کی بنا پر۔ یہی معاملہ اُس مشہور قولِ رسول کا ہے جس میں آپ نے خلافت کی بابت فرمایا تھا: **الأئمة من قریش**۔ اجتماعی نزاعات کے موقع پر آدمی کو زیادہ سے زیادہ جس حد تک جانے کی اجازت ہے وہ ناصحانہ قول ہے نہ کہ متشددانہ اقدام۔

اسی طرح حدیث میں آیا ہے کہ إنّ من أمتی لاتجتمع علی ضلالة (ابن ماجہ، کتاب الفتن) میری امت گمراہی پر مجتمع نہیں ہوگی۔ اس حدیث کا یہ مطلب نہیں کہ امت کے افراد جب بڑی تعداد میں کسی بات پر متحد ہوجائیں تو وہ بات درست قرار پائے گی۔ بلکہ اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ امتِ مسلمہ میں ایسا کبھی نہیں ہوگا کہ امت کے تمام افراد گمراہی کی ایک بات پر متفق ہوجائیں۔ امت میں ہمیشہ ایسے کچھ افراد ضرور موجود رہیں گے جو گمراہی کو گمراہی سمجھیں اور اس کا اعلان کریں۔

اس حدیث کو عام طور پر امتِ مسلمہ کی فضیلت کے معنٰی میں لیا جاتا ہے۔ اس قسم کا عقیدہ بالکل غلط ہے۔ اس حدیث کا مطلب دراصل یہ ہے کہ امتِ مسلمہ کو خدا کی طرف سے جو کتاب دی گئی ہے وہ چوں کہ ایک ایسی کتاب ہے جو ہمیشہ محفوظ رہے گی۔ اس لیے ایسا کبھی نہیں ہوگا کہ ساری امت گمراہی میں پڑ جائے۔ امتوں کی گمراہی کا سبب ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ خدا کی کتاب اپنی محفوظ حالت میں ان کے

پاس نہ رہے۔ کتاب اللہ کی عدم محفوظیت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سچائی کو جاننے کے لیے ریفرنس بُک موجود نہیں ہوتی۔ ریفرنس بُک کے محفوظ نہ ہونے کی وجہ سے یہ ممکن نہیں رہتا کہ اختلاف کے وقت اس کا تعین کیا جائے کہ سچائی کیا ہے۔ لیکن جب ریفرنس بک محفوظ حالت میں موجود ہو تو یہ ممکن ہوجاتا ہے کہ اختلاف کے وقت اس کو دیکھ کر صحیح نقطۂ نظر معلوم کیا جاسکے۔ قرآن کی یہی صفت، آخری امت کو اِس سے بچائے گی کہ اس کے تمام افراد گمراہ ہوجائیں، اور کوئی ایک فرد بھی ایسا نہ ہو جو سچائی کو جاننے والا ہو۔

سوال

الرسالہ اگست ۲۰۰۵ کے صفحہ ۲۹ سوال نمبر ۶ کے حوالے سے عرض ہے: حضرت موسیٰ نے بھی ایک بگڑی ہوئی مسلم قوم کو ایک علیحدہ ملک میں آباد کیا۔ اور تقسیم ملک کی مانگ کرنے والوں نے بھی تقریباً یہی کچھ کیا۔ آپ ایک کو صحیح قرار دیتے ہیں، اور دوسرے کو غلط، وجہ کیا ہے۔ کیا یہ وجہ ہے کہ ایک کام ایک اولوالعزم پیغمبر حضرت موسی کے ذریعے انجام پایا، اور دوسرا چند مسلمانوں کے ہاتھوں۔
(غلام قادر، سری نگر)

جواب

آپ کا یہ قیاس، قیاس مع الفارق ہے۔ قدیم مصر میں بنی اسرائیل ایک بلائے عظیم میں مبتلا تھے، جس کو قرآن میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: **یذبّحون أبناء کم ویستحیون نسائکم** (البقرہ: ۴۹) ہندستان میں جب اقبال اور جناح جیسے لوگوں نے تقسیم کی مانگ کی تو اُس وقت ہندستان میں ہرگز یہاں قدیم مصر جیسے حالات نہ تھے۔ اگر کوئی شخص ایسا کہتا ہے تو بلاشبہہ وہ خلافِ واقعہ بات کہتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُس وقت کے مسلمانوں کو ہندستان میں مکمل مذہبی آزادی حاصل تھی۔ ایسی حالت میں تقسیم ملک کا مطالبہ کرنا، ایک ناجائز فعل تھا، نہ کہ اُسوۂ موسیٰ کی پیروی۔

دوسری بات یہ کہ حضرت موسیٰ سارے بنی اسرائیل کو مصر سے باہر لے گیے۔ جب کہ تقسیم کے لیڈر ہندستان کے مسلمانوں کو کہیں باہر نہیں لے جارہے تھے بلکہ وہ صرف ایک ملک کو دو ملک میں بانٹ رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے عمل کا اُسوۂ موسیٰ سے کوئی تعلق نہیں۔

تیسری بات یہ کہ حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو ایک صحرا میں تربیت کے لیے لے گیے تھے۔ جب کہ تقسیم کے لیڈر فرضی طور پر اپنے بنائے ہوئے پاکستان میں ایسی صورت پیدا کر رہے تھے جہاں مسلمان فرقوں میں بٹ کر آپس میں ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگیں۔

آپ ایک کشمیری مسلمان ہیں۔ کشمیری مسلمانوں کے لیے ایسا کہنا اور بھی زیادہ بے معنی ہے۔ آپ لوگوں نے کشمیر کو ہندستان سے الگ کرنے کے لیے ہندستان سے لڑائی چھیڑ دی۔ حالاں کہ حضرت موسیٰ نے قدیم مصر میں ایسا نہیں کیا کہ مصر کے ایک خطے کو بقیہ ملک سے الگ کرنے کے لیے فرعون سے لڑائی چھیڑ دیں۔ اس کے برعکس، حضرت موسیٰ نے یہ کیا کہ بنی اسرائیل کو لے کر ملک کے باہر، صحرائے سینا میں چلے گیے۔ اس لحاظ سے آپ لوگوں کے لیے حضرت موسیٰ کے نمونے کی پیروی یہ ہوگی کہ آپ کشمیر کو چھوڑ کر چلے جائیں اور کسی بیرونی علاقے میں آباد ہو جائیں۔

سوال

میں ایک طالب علم ہوں اور چھ مہینوں سے الرسالہ پڑھ رہا ہوں۔ میں نے پایا کہ آپ نے غیر مسلموں میں اسلام کی دعوت کو انتہائی سنجیدگی کے ساتھ پیش کیا، اور امت مسلمہ کو اس کا بھولا ہوا مقصد یاد دلایا ہے۔ اس حقیقت کو قبول کر کے میں نے دعوت الی اللہ کی بات اپنے مسلمان بھائیوں سے خاص طور پر تبلیغی جماعت کے لوگوں سے کہی تو انھوں نے کہا ''ارے بھئی ہم تو سدھر جائیں، ابھی ہمارے اعمال خراب ہیں جب ہمارے اعمال اچھے ہو جائیں گے تو لوگ خود بخود اسلام میں داخل ہونے لگیں گے''۔ اس کا واضح جواب چاہتا ہوں۔ (ریحان خان، بھوپال)

جواب

اصولی اعتبار سے یہ بات غلط ہے کہ ''مسلمانوں کی اصلاح کرو، اور جب ان کی اصلاح ہو جائے گی تو لوگ خود بخود اسلام قبول کر لیں گے''۔ حقیقت یہ ہے کہ دعوت اپنے آپ میں ایک ذمّے داری ہے۔ دعوت کا کام ہر حال میں کرنا ہے، جس طرح نماز ہر حال میں پڑھنا ہے۔ کوئی بھی عذر دعوتی فریضے کی ادائیگی سے باہر رہنے کے لیے کافی نہیں۔ یہ حضرات اگر اپنے نظریے کو درست سمجھتے ہیں تو وہ

تارکینِ صلوٰۃ سے نماز پڑھنے کے لیے بھی نہ کہیں، وہ یہ کریں کہ وہ خود نماز پڑھیں اور یہ یقین کریں کہ لوگ ان کو دیکھ کر اپنے آپ نماز پڑھنے لگیں گے۔

تبلیغ کا کام کئی نسل سے چل رہا ہے۔ یہ لوگ اپنی تقریروں میں کہتے ہیں کہ ''اس کام کی برکت سے ساری دنیا میں کروروں لوگ دین دار بن چکے ہیں''۔ پھر یہ کروروں لوگ کیوں نہیں دعوت کے میدان میں آتے۔ ایسی حالت میں یا تو تبلیغ والوں کا یہ دعویٰ غلط ہے کہ انھوں نے ''ساری دنیا میں دین کی ہوائیں چلادی ہیں'' یا ان کے اندر یہ جذبہ ہی نہیں کہ دنیا کے لوگوں کو ہدایت ملے، اور وہ جہنم کے راستے کو چھوڑ کر جنت کے راستے پر چلنے لگیں۔

تبلیغی جماعت کا کام اگر صرف مسلمانوں کی اصلاح ہے تو ان کو دعوت کا لفظ ہرگز نہیں بولنا چاہیے۔ پھر انھیں اصلاح المسلمین کا لفظ بولنا چاہیے۔ تبلیغ و دعوت کا لفظ قرآن میں، غیر مسلموں میں اللہ کا پیغام پہنچانے کے لیے استعمال ہوا ہے۔ موجودہ حالت میں تبلیغی جماعت کا یہ نام ''برعکس نہند نامِ زنگی کافور'' کا مصداق ہے۔ تبلیغی جماعت، مسلم عوام میں ایک اچھا کام کررہی ہے۔ لیکن یہ اصلاح المسلمین کا کام ہے، وہ دعوت کا کام نہیں۔ تبلیغی جماعت ''مسجد وار تحریک'' ہے، وہ دعوت وار تحریک نہیں۔

تبلیغی جماعت کا کام مولانا الیاس صاحب کے زمانے سے آج تک ایک ہی نہج پر ہورہا ہے، وہ یہ کہ مسلمانوں میں نقل وحرکت کرکے ان کو مسجد میں لانا اور انھیں کلمہ اور نماز سکھانا، فضائل کے قصّے سُنا کر انھیں تبلیغ میں جوڑنا۔ اس جماعت کے عین مزاج کے مطابق، اس میں اکرامِ مسلم کا تصور تو ہے مگر اس میں اکرامِ انسان کا تصور نہیں۔ اس میں اصلاحِ امت کا تصور تو ہے مگر اس میں اصلاحِ انسانی کا تصور نہیں۔ بظاہر یہ کام ایک درست کام نظر آتا ہے مگر وہ **اثمهما اکبر من نفعهما (البقرہ ۲۱۹)** کا مصداق ہے۔ جماعت کے اس نہج کی بنا پر مسلمانوں میں دعوتِ عام کا تصور، شعوری طور پر حذف ہوگیا جو کہ امتِ محمدی کی اصل ذمے داری ہے۔ ایک عالم جو تبلیغی جماعت کو بہت قریب سے جانتے ہیں، انھوں نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا: ''تبلیغی جماعت نے دعوت کو ہائی جیک کرلیا ہے۔'' ان کا یہ تبصرہ بلاشبہہ جماعت کی مذکورہ صورتِ حال کے عین مطابق ہے۔

یہ ایک بے بنیاد مفروضہ ہے کہ مسلمان اگر سُدھر جائیں تو غیر مسلم ان کو دیکھ کر اسلام کو اختیار کرلیں گے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ دنیا میں ایک لاکھ سے زیادہ پیغمبر آئے، اور یہ پیغمبر مسلّمہ طور پر اخلاق کے اعلیٰ معیار پر تھے۔ مگر ایسا نہیں ہوا کہ پیغمبروں کو دیکھ کر لوگ خدا کے دین کو اختیار کرلیں۔ حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ اور دوسرے تمام پیغمبروں کا وہ حال ہوا جس کو قرآن میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: **یا حسرةً علی العباد ما یأتیهم من رسول إلا كانوا به يستهزؤن** (یٰس: ۳۰)

اصل یہ ہے کہ آدمی جب کسی کو نیکی کی تلقین کرے تو سنجیدگی کا تقاضا ہے کہ وہ خود بھی اس پر کاربند ہو۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ عمل، دعوت کی شرط ہے۔ دعوت کا کام ہر حال میں جاری رکھا جائے گا، خواہ داعی عامل ہو یا نہ ہو۔ ابن کثیر نے سورۃ البقرہ آیت ۴۴ کے تحت لکھا ہے کہ ’’معروف کی تلقین کرنا اور اس پر عمل کرنا دونوں واجب ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک دوسرے کے ترک سے ساقط نہیں ہوتا۔ علماء سلَف اور علماء خلَف کا صحیح ترین قول یہی ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ عالم معروف کی تلقین کرے گا اگرچہ وہ اس پر عمل نہ کرتا ہو، اور وہ منکر سے روکے گا اگرچہ وہ خود اس کا مرتکب ہو — ’’اگر ایسا ہوتا کہ آدمی صرف اُس وقت معروف کی تقلین کرے اور منکر سے روکے جب کہ اس کے اندر کوئی چیز نہ پائی جارہی ہو تو کسی شخص نے بھی معروف کی تلقین نہ کی ہوتی اور نہ وہ منکر سے روکتا‘‘۔ (سعید بن جبیر تابعی، تفسیر ابن کثیر، جلد اوّل، صفحہ ۸۵)

اصل یہ ہے کہ دعوت احساس ذمے داری کے تحت ظاہر ہونے والا عمل ہے نہ کہ احساسِ صالحیت کے تحت۔ مدعو جب اپنے دین کو چھوڑ کر اسلام کو اختیار کرتا ہے تو وہ اسلام کی اپنی صداقت کی بنا پر ایسا کرتا ہے، نہ کہ مسلمانوں کو باعمل دیکھ کر۔ اگر داعی کے باعمل ہونے کو دیکھ کر لوگ حق کو قبول کرتے تو تمام انبیا کے گرد انسانوں کی بھیڑ دکھائی دیتی۔ مگر معلوم ہے کہ پیغمبر آخر الزماں کے سوا کسی بھی پیغمبر کے گرد انسانوں کی کوئی بڑی جماعت اکھٹا نہیں ہوئی۔ اَعداد و شمار کے مطابق، ہر سال صرف امریکا میں تقریباً ایک لاکھ غیر مسلم اسلام میں داخل ہوتے ہیں۔ اگر یہ درست ہے کہ مسلمانوں کو باعمل دیکھ کر لوگ اسلام میں

داخل ہوتے ہیں، تو کیا امریکا اور دوسرے مقامات پر رہنے والے مسلمان ایسے ہی باعمل ہیں جنھیں صرف دیکھ کر غیر مسلموں کی اتنی بڑی تعداد اسلام میں داخل ہوجائے۔ اصل یہ ہے کہ دعوت ہر حال میں اور ہر شخص کو دینا ہے۔ اس کے لیے مذکورہ قسم کی کوئی شرط نہیں لگائی جاسکتی۔ البیہقی اور ابن عساکر نے جابر بن عبداللہ سے روایت کیا ہے کہ حضرت حُذیفہ نے ہم سے کہا کہ ہم اس علم (دینِ حق) کے حامل بنائے گیے تھے، اس کو ہم تمھیں دے رہے ہیں، اگرچہ ہم خود اس پر عمل نہ کرسکے (**انا حُمّلنا هٰذا العلم، وإنّا نؤدّيه اليكم وان كنا لا نعمل به**، حياة الصحابة، ۳/ ۲۶۸)

سوال

میرے ذہن میں اکثر یہ سوال آتا ہے کہ جب کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے خواہ وہ ہندو کے گھر میں ہو یا مسلمان کے گھر میں۔ یہ اللہ کی مرضی ہے۔ وہ بچہ اسی ماحول کے مطابق بڑا ہوکر ہندو یا مسلمان بنتا ہے۔ اس میں اُس کا کیا قصور۔ (محمد نثار احمد، جھارکھنڈ)

جواب

آپ نے جو سوال کیا ہے اس کا تعلق صرف غیر مسلم گھر میں پیدا ہونے والے بچے سے نہیں ہے۔ بلکہ اس کا تعلق خود مسلمان خاندان میں پیدا ہونے والے بچے سے بھی ہے۔ اس معاملے میں دونوں کا کیس بالکل یکساں ہے۔ اصل یہ ہے کہ پیدا ہونے کے بعد ہر انسان کی کنڈیشننگ شروع ہوجاتی ہے۔ گھر کے اندر اور گھر کے باہر کا ماحول مسلسل طور پر ہر ایک کی کنڈیشننگ کرتا رہتا ہے۔ اس لیے ہر ایک انسان کنڈیشنڈ مائنڈ کا حامل ہوتا ہے۔ غالباً اسی کنڈیشننگ کے معاملے کو قرآن میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: **ثمّ رددناه أسفل سافلين**۔ ہر آدمی کی یہ ذمّے داری ہے کہ شعور کی عمر کو پہنچنے کے بعد وہ اپنی ڈی کنڈیشننگ کرے۔ اس طرح وہ دوبارہ اپنے آپ کو اُس حالتِ فطری پر واپس لے جائے جس کو قرآن میں **لقد خلقنا الانسان في أحسن تقويم** کہا گیا ہے۔ اس ڈی کنڈیشننگ کے بغیر کوئی شخص جنت میں داخلے کا مستحق نہیں بن سکتا۔ جو شخص اپنی ڈی کنڈیشننگ کرے وہ **قد افلح من زكّٰها** کا مصداق ہے اور جو شخص اپنی ڈی کنڈیشننگ نہ

کرے وہ قد خاب من دسّٰها کا مصداق۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام کا آغاز کسی شخص کے لیے مسلم خاندان میں پیدا ہونے سے نہیں ہوتا، بلکہ معرفت یا ڈسکوری سے ہوتا ہے۔ غیر مسلم اگر حق کا مسافر اسلام کی ڈسکوری سے بنتا ہے تو مسلمان اُس وقت حق کا مسافر بنتا ہے جب کہ اسلام اس کے لیے ری ڈسکوری بن جائے۔ پہلی قسم کے لوگوں کے لیے قرآن میں انّ الانسان لفی خسر إلا الّذین آمنوا کے الفاظ آئے ہیں اور دوسری قسم کے لوگوں کا ذکر ان الفاظ میں کیا گیا ہے: یا أیها الذین آمَنوا آمِنوا (النساء: ۱۳۶)

سوال

میں نے ایک حدیث پڑھی جس میں لکھا تھا ”جنت تلواروں کی چھاؤں میں ہے“۔ اس کا کیا مطلب ہے۔ (ایک قاری، الرسالہ)

جواب

حدیث (ان ابواب الجنة تحت ظلال السیوف) ایک ایسے موقع کی حدیث ہے جب کہ عملاً جنگ چھڑی ہوئی ہو، اور اسلام کے خلاف جارحیت کا، میدانِ مقابلہ میں بالفعل دفاع کیا جارہا ہو۔ ایسے غیر معمولی وقت میں اہلِ ایمان پر فرض ہوجاتا ہے کہ وہ اسلام کی صفوں میں داخل ہو کر دشمن سے دفاعی مقابلہ کریں اور اسلام کی حفاظت کو یقینی بنائیں۔ آپ کو اس حدیث کے بارے میں اِشکال اس لیے پیدا ہوا کہ آپ نے اِس کو امن کی حالت یا عام حالت سے متعلق سمجھ لیا۔ حالاں کہ ایسا نہیں ہے۔ عام حالت کے بارے میں اسلام کی جو پالیسی ہے، اس کا بیان پیغمبر اسلام کے اس قول میں ملتا ہے: لا تتمنوا لقاءَ العدوّ، واسئلوا الله العافیة (دشمن سے مدبھیڑ کی تمنا نہ کرو، اللہ سے ہمیشہ امن وعافیت مانگو)۔

سوال

نومبر ۲۰۰۳ کا الرسالہ آپ کے امریکا کے سفر پر مشتمل ہے آپ نے صفحہ انیس پر لکھا ہے کہ برصغیر کے مسلمان، ہندستان کے ہندوؤں سے نفرت کرتے ہیں“۔ میرے خیال سے یہ بات کسی طرح بھی صحیح نہیں۔ ہوسکتا ہے چند لوگ ہوں، اور اگر کوئی ان سے نفرت کرتا بھی ہے تو ان سے نہیں

بلکہ ان کے عمل سے کرتا ہے (عبدالغفار ندوی، مہاراشٹر)

جواب

فعل سے نفرت ہی کا دوسرا نام فاعل سے نفرت ہے۔ فعل اور فاعل کو نظری منطق میں ایک دوسرے سے جدا کیا جا سکتا ہے۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے دونوں ایک ہیں۔ اگر فعل اور فاعل دونوں الگ الگ ہوتے تو آخرت میں خدا کو یہ کرنا چاہیے تھا کہ وہ صرف فعل کو سزا دے اور فاعل کو اس سے جدا کر کے چھوڑ دے۔ ہندستانی مسلمانوں کی نفسیات کے بارے میں مذکورہ بیان کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ مسلمانوں کے اخبارات ہندوؤں کے خلاف شکایت سے بھرے ہوتے ہیں مگر ان میں مسلمانوں کی اس دعوتی ذمّے داری کا کوئی چرچا نہیں ہوتا کہ ہندوؤں کی شکایتوں کو بھلا کر اُن لوگوں تک خدا کا پیغام پہنچایا جائے۔

سوال

آپ نے اپریل ۲۰۰۵ کے الرسالہ کے صفحہ ۳۹ پر لکھا ہے ''کہ شعر ایک لفظی آرٹ ہے۔ وہ انسان کے لیے صرف ذہنی تفریح کا سامان بن سکتا ہے۔ شعر کسی حقیقی اصلاح کا ذریعہ نہیں بن سکتا۔'' جب کہ میں نے ایک حدیث پڑھی جس کا ترجمہ ہے ''بلا شبہہ بعض شعر حکمت ہوتے ہیں''۔ (ایک قاری، الرسالہ، بہار)

جواب

الرسالہ اپریل ۲۰۰۰ صفحہ ۳۹ میں جو بات کہی گئی ہے اس کو آپ نے غالباً سرسری طور پر پڑھا۔ اگر اس کو زیادہ غور کے ساتھ پڑھتے تو آپ کو خود ہی اس میں اپنے سوال کا جواب مل جاتا۔ حدیث میں جو بات کہی گئی ہے وہ صرف اس مفہوم میں ہے کہ شعر میں بعض حکمت کی بات ہو سکتی ہے۔ مگر الرسالہ میں جو بات کہی گئی ہے وہ تاثیر کے اعتبار سے ہے نہ کہ صرف کسی قولِ حکمت کی موجودگی کے اعتبار سے۔ یہ ممکن ہے کہ کسی شعر میں کوئی ایسی بات ہو جو بظاہر حکمت کی بات ہو، مگر ایسا کبھی نہیں ہو سکتا، اور نہ کبھی ایسا ہوا ہے کہ شاعرانہ کلام کے ذریعے وہ چیز پیدا ہو جائے جس کو الرسالہ کی

مذکورہ عبارت میں ''قوم کے اندر حقیقی بیداری'' کا نام دیا گیا ہے۔ اقبال نے اپنے خیال کے مطابق احیاءِ ملّت کے مقصد کے تحت شاعری کا طریقہ اختیار کیا تھا مگر عملاً یہ ہوا کہ وہ لوگوں میں صرف ایک غزل خواں بن کر رہ گیے۔ جیسا کہ خود اقبال نے کہا ہے: مرا یاراں غزل خوانے شمُردند۔

اس حقیقت کو قرآن میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ: **الشعراء یتبعهم الغاؤن** (الشعراء: ۲۲۴) یعنی شعر کے ذریعے اس کے متبعین کا جو گروہ پیدا ہوتا ہے وہ صرف غیر سنجیدہ لوگوں کا گروہ ہوتا ہے۔ سنجیدہ لوگ کبھی شاعر کے گرد اکھٹا نہیں ہوتے۔

سوال

میں جامعہ دارالسلام عمر آباد کا ایک طالب علم ہوں، میں آپ کی تحریروں اور مضامین سے زیادہ متاثر ہوں اور میں بھی آپ جیسا ایک مشہور محرّر اور مصنف بننا چاہتا ہوں تو میں اس کے لیے کیا کروں۔ میں آپ کے پرچہ ''الرسالہ'' سے بہت متاثر ہوں۔ (شیخ اسماعیل بن شیخ افضل، حیدر آبادی)

جواب

ہر چیز کی ایک قیمت ہے۔ اسی طرح اچھا عالم اور اچھا مصنف بننے کی بھی ایک قیمت ہے۔ آپ وہ قیمت ادا کیجیے اور پھر آپ اچھے مصنّف بن جائیں گے۔

سوال

بڑی طاقت کے سامنے لڑنا اپنے آپ کو ذلیل کرنا ہے۔ جنگ بدر میں مسلمانوں کی تعداد تین سو تیرہ تھی اور غیر مسلموں کی تعداد ایک ہزار۔ نعوذ باللہ کیا رسول اللہ نے ذلیل ہونے کے لیے قتال کیا تھا۔ (عیاض احمد، دہلی)

جواب

مکّی دَور میں مخالفین اسلام نے اہلِ ایمان کو ستانا شروع کیا تو عمر فاروقؓ نے کہا: ہم ان کے خلاف جہاد کریں گے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع کیا اور فرمایا: **یا عمر انّا قلیل!**

(اے عمر! ہم تھوڑے ہیں) یہ اُس صورتِ حال کا معاملہ ہے جب کہ مسلمان قلیل ہوں اور ان کے حریف کثیر تعداد میں ہوں۔ ایسی غیر متناسب حالت میں اپنے حریفوں سے جہاد کے نام پر جنگ چھیڑنا، بلاشبہہ رسول اللہ کی سنت کے خلاف ہے۔

جہاں تک غزوۂ بدر کا معاملہ ہے تو اس کی صورت حال بالکل مختلف تھی۔ اس وقت اگر چہ اہل ایمان کی تعداد تین سو تیرہ تھی مگر جیسا کہ قرآن سے ثابت ہے، اللہ تعالیٰ نے پَے درپَے اپنی طرف سے فرشتے بھیجے۔ حتی کہ ان فرشتوں کی تعداد پانچ ہزار تک پہنچ گئی۔ غزوۂ بدر کے موقع پر مخالفین کی تعداد ایک ہزار تھی اور اہل ایمان کی تعداد تین سو تیرہ۔ اب فرشتوں کو شامل کر کے اہلِ ایمان کی صَف میں پانچ ہزار تین سو تیرہ کی فوج ہوگئی۔ اس طرح مسلمان عددی اعتبار سے مخالفین سے بہت بڑھ گیے، نیز طاقت کے اعتبار سے بھی۔ کیوں کہ فرشتوں کی طاقت انسان کے مقابلے میں اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ ایک ہی فرشتہ پوری فوج کو ہلاک کرنے کے لیے کافی ہے۔

سوال

جماعت اسلامی کا سہ روزہ اخبار ''دعوت'' دہلی سے نکلتا ہے۔ اس کا اِشو ۱۹/اپریل ۲۰۰۵ سامنے آیا۔ یہ اشو جہاد کے سبجیکٹ پر ''اسپیشل اِشو'' کے طور پر چھپا ہے۔ اس اشو میں ایک صاحب کا آرٹکل، اس ہیڈنگ کے ساتھ ہے: ''جہاد، اسلام کی اخلاقی حدود کا پابند ہے''۔ اس آرٹکل میں ایک سوال کے جواب میں وہ لکھتے ہیں: ''جو قومیں اسلام سے ناواقف ہیں، ان کے درمیان اسلام کے تعارف کی سعی بہت کم ہوئی ہے اور جو ہوئی ہے، واقعہ یہ ہے کہ اس سطح کی نہیں ہے جس سطح کی ہونی چاہیے اور اُن زبانوں میں نہیں ہے جو اُن کی زبانیں ہیں۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ ہم نے موجودہ دَور کے فکر اور فلسفے کو غلط اور اسلام کو حق ثابت کر دیا ہے، اور جو کوئی اس کی مخالفت کرتا ہے، وہ ضد اور ہٹ دھرمی کا شکار ہے''۔ (صفحہ ۲۷)

میں ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں مینیجر ہوں۔ میری ایجوکیشن امریکا اور لندن میں ہوئی ہے۔ میری زبان انگریزی ہے۔ میں نے آپ کی سب انگلش کتابیں کئی بار پڑھی ہیں، اور میں نے اپنے مسلم شوہر

سے آپ کی اردو کتابیں پڑھوا کر سُنی ہیں۔ پانچ سال پہلے میں اسلام سے ہیٹ کرتی تھی۔ مگر آپ کی کتابوں کی اسٹڈی کے بعد میں نے اسلام میں سچائی کو ڈسکور کیا ہے، اور اس کو پورے کنوکشن کے ساتھ مانا ہے۔ میرے جیسے میرے کئی نان مسلم ساتھی جو ہائی ایجوکیشن لیے ہوئے ہیں، انھوں نے آپ کی کتابوں کو پڑھ کر اسلام میں ڈوائن ٹرتھ کو ڈسکور کیا ہے۔ حالاں کہ پہلے وہ بھی میری طرح اسلام سے ہیٹ کرتے تھے۔ میں نے اور میرے نان مسلم ساتھیوں نے ماڈرن اسٹینڈرڈ کی ایجوکیشن لی ہے۔ اپنے جاب کے اعتبار سے ہم اُنھیں لوگوں کے بیچ میں رہتے ہیں، جن کو ہائی ایجوکیٹیڈ لوگ کہا جاتا ہے۔ میں اور میرے نان مسلم ساتھی پورے کنوکشن کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ آپ کا لٹریچر اُس لیول کا ہے جو آج کا لیول سمجھا جاتا ہے۔

میں نے اور میرے نان مسلم ساتھیوں نے آپ کا انگریزی لٹریچر بہت سے ہائی ایجوکیٹیڈ لوگوں کو دیا ہے۔ ان میں سے کسی ایک نے بھی یہ نہیں کہا کہ یہ لٹریچر آج کے ماڈرن لیول کے مطابق نہیں۔ میرے اور میرے دوسرے تمام ساتھیوں کے نزدیک، آج کا کوئی ایسا انٹلکچول لیول نہیں جس پر آپ کا لٹریچر پورا نہ اُترتا ہو۔ ہوسکے تو آپ اس معاملے کے بارے میں لکھیں (پِریا ملک، نئی دہلی)

جواب

''جہاد نمبر'' میں جماعت اسلامی کے ایک بزرگ کا جو مضمون چھپا ہے، اس کو میں نے دیکھا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا سوال خود صاحب مضمون سے ہونا چاہیے۔ صاحب مضمون کا مذکورہ تبصرہ ایک تقابلی تبصرہ ہے۔ انھوں نے وقت کی ایک علمی سطح کو مان کر اس سے مطبوعہ اسلامی لٹریچر کا تقابل کیا ہے۔ ایسی حالت میں ان کو یہ بتانا چاہیے کہ وقت کی علمی سطح کا تصور ان کے ذہن میں کیا ہے۔ اس کے بغیر مذکورہ قسم کا تقابل ممکن نہیں۔

ان کا یہ مضمون گویا اس بات کا دعویٰ ہے کہ وہ وقت کی علمی سطح کو جانتے ہیں۔ اگر یہ سطح ان کے علم میں نہ ہو تو وہ تقابل کرنے کے اہل ہی نہیں ہوسکتے۔ ایسی حالت میں ''جہاد نمبر'' کے مضمون نگار کو سب سے پہلے یہ بتانا چاہیے کہ وقت کی وہ علمی سطح کیا ہے، تاکہ اس کی روشنی میں مطبوعہ اسلامی لٹریچر کو جانچا جاسکے۔

حقیقت یہ ہے کہ اس معاملے میں مضمون نگار کے لیے دو میں سے ایک کا انتخاب ہے۔ یا تو وہ وقت کی علمی سطح کو بتائیں اور ساتھ ہی کم از کم کوئی ایک ایسی کتاب کا نام بتائیں جو ان کے نزدیک وقت کی علمی سطح کو بتارہی ہو یا اس کے مطابق ہو۔ اگر وہ ایسی کسی کتاب کا نام نہ بتاسکیں تو ان کو یہ کرنا چاہیے کہ وہ یہ کہیں کہ میں نہیں جانتا کہ وقت کی علمی سطح کیا ہے۔ اس لیے میں اس پوزیشن میں نہیں ہوں کہ اس سے تقابل کرکے بتاؤں کی مطبوعہ اسلامی لٹریچر اس کے مطابق ہے یا نہیں۔ مضمون نگار کے لیے ان دو کے علاوہ کوئی تیسری صورت جائز نہیں۔

سوال

اللہ تعالیٰ سورہ ق میں فرماتا ہے کہ ہم نے زمین اور آسمان اور جو کچھ ان کے درمیان ہے چھ دنوں میں پیدا فرمایا (۳۸) جب کہ اللہ تعالیٰ کو یہ قدرت عظیم بھی حاصل ہے کہ ''اذا اراد شیئا ان یقو ل له کن فیکون''۔ تو اس چھ دنوں میں پیدا کرنے میں اللہ تعالیٰ کی کیا حکمت ہے۔ (وسیم بھٹ، کشمیر)

جواب

۶ دنوں سے مُراد چھ دَور (periods) ہیں۔ اصل یہ ہے کہ ''کن فیکون'' کی آیت میں خدا کی قدرت کا بیان ہے، اور ''ستّة أيّام'' کی آیت میں خدا کے طریقے (Method) کا بیان ہے۔ خدا کو بلاشبہہ یہ قدرت حاصل ہے کہ وہ ایک لمحے میں پوری کائنات کو پیدا کردے۔ مگر اپنی حکمت کے تحت خدا نے یہ کیا کہ کائنات کو وجود میں لانے کے لیے تدریج کا طریقہ اختیار کیا۔

تدریج کی اِس حکمت کا ایک پہلو غالباً یہ ہے کہ انسان اپنے عمل میں بھی تدریج کے اس نمونے کو اختیار کرے۔ وہ اچانک چھلانگ لگا کر اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش نہ کرے، بلکہ وہ ترتیب اور تدریج کے اصول پر منصوبہ بند انداز میں کام کرکے اپنا مقصد حاصل کرے۔ فطرت کا جو اصول ہے اسی کو انسان اپنی زندگی کی تعمیر میں بھی اختیار کرے۔

۱۔ روزنامہ دَینک جاگرن (نئی دہلی) کے نمائندہ ارشد فریدی نے ۲ جولائی کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق مظفر نگر کے واقعے (۴ جون) سے تھا۔ جواب میں بتایا گیا کہ اس معاملے میں علماء اور جماعتوں کا فتویٰ غلط ہے۔ اسلام کے مطابق سزا برا فعل کرنے والے کو ملے گی نہ کہ بالجبر برے فعل کا شکار ہونے والے کو۔ میرے نزدیک اس معاملے میں عمرانہ بے قصور ہے۔ اس معاملے کی تفصیلی روداد انگریزی میگزین آؤٹ لُک (Out Look) کے شمارہ ۱۸ جولائی ۲۰۰۵ میں دیکھی جاسکتی ہے۔

۲۔ الرسالہ مطبوعات کے تحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پر اب تک تین کتابیں شائع ہوچکی ہیں— پیغمبر انقلاب، مطالعۂ سیرت، سیرتِ رسول۔ اب سیرت کے موضوع پر چوتھی کتاب زیر تیاری ہے۔ اس کا نام پیغمبر امن (The Prophet of Peace) ہوگا۔ یہ کتاب انشاء اللہ جلد ہی اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں شائع کی جائے گی۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، اس کتاب میں پیغمبر اسلام کی تعلیمات کے امن والے پہلو کو نمایاں کیا جائے گا یہ کتاب تقریباً تین سو صفحے کی ہوگی۔

۳۔ ۲۹ جولائی ۲۰۰۵ء کو نئی دہلی کے مودی ہاؤس میں ایک انٹر فیتھ کانفرنس ہوئی۔ اس میں مختلف مذاہب کے نمائندوں نے انٹر فیتھ ہارمنی کے موضوع پر اظہار خیال کیا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ اور انٹر فیتھ ہارمنی کے موضوع پر اسلام کی تعلیمات پیش کیں۔

۴۔ پُٹّا پَرتھی (آندھرا پردیش) میں بہت بڑا سائی انٹرنیشنل سینٹر قائم ہے۔ اس کے تحت پٹا پرتھی میں ایک انٹرنیشنل کانفرنس ۲۱۔ ۲۳ جولائی ۲۰۰۵ کو ہوئی۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور ''اسلام اور پیس'' کے موضوع پر آدھ گھنٹے کی ایک تقریر کی۔ اس تقریر کو عام طور پر بہت پسند کیا گیا۔ اس کے علاوہ لوگوں نے بہت شوق سے انگریزی کتابیں مطالعے کے لیے لیں۔ اس کے علاوہ واپسی میں دو دن بنگلور میں قیام رہا۔ اس سفر کی روداد سفر نامے کے تحت شائع کردی جائے گی۔

۵۔ خواجہ کلیم الدین صاحب امریکا میں رہتے ہیں۔ وہ مسلسل انٹرنیٹ کے ذریعے الرسالہ کا مشن پھیلا رہے ہیں۔ حال میں ان کا ایک خط ۲۲ جولائی ۲۰۰۵ کو موصول ہوا ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ انھوں نے عراق کے غیر مسلموں اور عیسائیوں میں الرسالہ کا دعوتی پیغام پہنچانے کا کام شروع کیا ہے۔ ان کا ای میل آئی ڈی یہ ہے:

kkaleemuddin@gmail.com

۶۔ ڈائری (94-93) چھپ کر شائع ہوگئی ہے۔ یہ 387 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس سے پہلے حسب ذیل ڈائریاں چھپ کر شائع ہوچکی ہیں— ڈائری (84-83) ڈائری (90-89) ڈائری (92-91)۔ اس طرح ڈائری کی کُل چار جلدیں شائع ہوچکی ہیں۔

۷۔ برمنگھم کا ادارہ اسلامک ویژن (Islamic Vision) ایک دعوتی ادارہ ہے۔ اسلامی مرکز کی مطبوعات کی توسیع واشاعت میں اس کا تعاون مسلسل جاری رہا ہے۔ حال میں انھوں نے انگریزی کتاب اسلام ایز اٹ از (Islam As It Is) کو بڑی تعداد میں شائع کر کے یورپ میں لوگوں کے درمیان مفت تقسیم کیا ہے۔ یہ کتاب پہلی بار دہلی سے ۱۹۹۲ میں چھپی۔ اس کتاب کا مذکورہ اڈیشن اسلامک ویژن نے ۲۰۰۵ میں چھپوایا ہے۔ یہ 114 صفحات پر مشتمل ہے۔ عمومی حلقے میں اسلام کے تعارف کے لیے یہ کتاب بہت مفید ثابت ہوئی۔

۸۔ ۲/اگست ۲۰۰۵ کو ناروے کے مسٹر آرنے سویراس (Arne Saeveraas) کی قیادت میں ایک ڈیلی گیشن اسلامی مرکز میں آیا۔ یہ لوگ ناروے کے ناروین چرچ ایڈ (NorweigianChurch Aid) کے نمائندے تھے۔ یہ ادارہ انڈیا اور پاکستان کے درمیان امن کے قیام کی کوشش کررہا ہے۔ خاص طور پر دونوں ملکوں کے مذہبی افراد کے درمیان ڈائیلاگ کے ذریعے وہ ایسا کرنا چاہتے ہیں۔ اس مشن کے تحت وہ صدر اسلامی مرکز سے ملے۔ مسٹر آرنے سویراس کے ساتھ چنڈوال پال مارٹن (Chandual Paul Martin) بھی تھے جو کہ مدراس کے لتھران چرچ (Luthran Churchi) کے جنرل سکریٹری ہیں۔ ان لوگوں کو کئی انگریزی کتابیں دی گئیں۔ انھوں نے پیس مشن کے سلسلے میں صدر اسلامی مرکز کی باتوں کو بہت پسند کیا۔ اور ان کو نہایت مفید بتایا۔

۹۔ انگریزی میگزین آؤٹ لک (نئی دہلی) کی بیورو چیف صبا نقوی اور انگریزی روزنامہ ٹیلیگراف کے اسپیشل کرسپانڈنٹ پورنما جوشی نے ۱۲/اگست ۲۰۰۵ کو صدر اسلامی مرکز کا مشترک انٹرویو لیا۔ انٹرویو کا موضوع جہاد اور خودکُش بمباری تھا۔ سوالات کے جواب میں بتایا گیا کہ اسلام میں خودکُشی یا خودکُش بمباری دونوں یکساں طور پر حرام ہیں۔ جہاد کے نام پر آج کل مسلمانوں کے اندر جو متشددانہ کارروائیاں جاری ہیں وہ بھی اسلامی شریعت میں جائز نہیں۔ کیوں کہ اسلام میں جنگ صرف ایک قائم شدہ حکومت کا کام ہے۔ غیر حکومتی تنظیموں کو یہ حق نہیں کہ وہ بطور خود مسلّح جہاد شروع کردیں۔ نیز حکومت کے لیے بھی صرف جارحانہ حملے کی صورت میں دفاعی جنگ جائز ہے۔ اسی طرح پراکسی وار بھی اسلام میں جائز نہیں۔ اِن خواتین کو امن اور اسلام کے موضوع پر چار انگریزی کتابیں دی گئی اور کچھ مضامین دیے گیے۔

۱۰۔ ایشین نیوز اینڈ انفارمیشن نٹ ورک (نئی دہلی) کے ڈائرکٹر راجن تیواری نے ۸ اگست ۲۰۰۵ کو دوردرشن کے لیے تفصیلی ویڈیو انٹرویو ریکارڈ کیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر کشمیر اور دوسرے مقامات پر جہاد کے نام سے ہونے والے تشدد سے تھا۔ جواب میں بتایا گیا کہ موجودہ متشددانہ جہاد مسلمانوں کا ایک فعل ہے۔ اس کا اسلام کی تعلیمات سے کوئی تعلق نہیں۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق جہاد صرف پرامن جدوجہد کا نام ہے۔ جہاں تک جنگ یا قتال کا تعلق ہے وہ صرف دفاع کے لیے جائز ہے۔ اور یہ دفاعی جنگ بھی ایک باقاعدہ حکومت کرسکتی ہے۔ اس دفاعی جنگ کی بھی بہت سی شرطیں ہیں۔ مثلاً غیر مقاتلین (non-combatants) اور بچوں اور عورتوں کو نہ مارنا، وغیرہ۔

۱۱۔ امریکا میں ایک ادارہ ہے جس کا نام: یوتھ فار ہیومن رائٹس انٹرنیشنل (Youth for Human Rights International) ہے۔اس کا صدر دفتر لاس انجلیس میں ہے۔اس ادارے کے تحت پہلی انٹرنیشنل یوتھ سمٹ امریکا میں ہوئی۔ اس کے تحت دوسری انٹرنیشنل سمٹ ۴ اگست ۲۰۰۵ کو نئی دہلی میں سائی انٹرنیشنل سینٹر کے آڈیٹوریم میں ہوئی۔صدر اسلامی مرکز نے اس کی دعوت پر اس میں شرکت کی۔انھوں نے واٹ آر ہیومن رائٹس نامی کتاب (مطبوعہ امریکا) کا اجرا کیا۔اس کے بعد انھوں نے ایک تقریر کی۔اس تقریر میں انھوں نے حضرت علی کا یہ قول لوگوں کو سنایا: قیمة المرء ما یحسنہ: The value of a person lies in excellence۔انھوں نے نوجوانوں کو بتایا کہ اس کے مطابق کامیابی کا بہترین اصول یہ ہے کہ آپ بہتر کریں تو دوسروں سے بھی آپ کو بہتر ملے گا:.Do your best, and find the best حاضرین نے دل چسپی کے ساتھ اس کو نقل کیا۔

۱۲۔ٹی وی کمپنی افسانہ بے بی لون (Afsana Babylon) کے ڈائریکٹر مُرادعلی ۱۰/اگست ۲۰۰۵ کو اپنی ٹیم کے ساتھ اسلامی مرکز میں آئے۔اُنھوں نے اپنی مجوزہ فلم ''رحمت'' کے لیے صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی ویڈیو انٹرویو ریکارڈ کیا۔سوالات کا تعلق زیادہ تر تشدد اور امن کے مسئلے سے تھا۔جوابات میں بتایا گیا کہ امن انسانی زندگی کی ایک لازمی ضرورت ہے۔تشدد کے حالات میں کوئی بھی تعمیری کام نہیں کیا جاسکتا۔مسٹر مرادعلی کو موضوع سے متعلق کچھ کتابیں دی گئیں۔

۱۳۔انٹرفیتھ ہارمنی فاؤنڈیشن آف انڈیا کی طرف سے نئی دہلی کے اسکوپ کنوینشن سینٹر (scope convention centre) میں ۶/اگست ۲۰۰۵ کو ایک کانفرنس ہوئی۔ڈاکٹر کرن سنگھ اس کے صدر تھے۔اس کی دعوت پر صدر اسلام مرکز نے اس میں شرکت کی۔اور ''اسلام اینڈ پیس'' کے موضوع پر انگریزی میں ایک تقریر کی۔اس موقع پر صدر اسلامی مرکز کو ایک نیشنل ایوارڈ دیا گیا۔اس ایوارڈ کا نام یہ تھا:

Mahatma Gandhi National Award For Tolerence-2005

۱۴۔دہلی کے انگریزی میگزین ڈی این اے (Daily News and Analysis) کی نمائندہ مز سنگیتا سنگھ (Tel. 55604444) نے ٹیلی فون پر صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو ۱۷/اگست ۲۰۰۵ کو ریکارڈ کیا گیا۔خاص سوال یہ تھا کہ ایک دار الافتاء نے فتویٰ جاری کیا ہے کہ مسلم عورتیں الکشن میں ووٹ دینے کے لیے نہ جائیں۔اور اگر جاتی ہیں تو برقع پہن کر جائیں۔ جواب میں بتایا گیا کہ اس قسم کا فتویٰ موجودہ حالات میں بالکل بے فائدہ ہے۔سیاسی معاملات میں مسلم ملکوں میں بھی فتویٰ نہیں چلتا پھر وہ انڈیا میں کیسے چلے گا۔ایسے معاملات میں مفتی صاحبان کو حالات کے مقابلے میں اپنی بے بسی کا احساس کرتے ہوئے خاموش رہنا چاہیے۔اسلام کا ایک اصول یہ بھی ہے کہ جن معاملات میں آدمی موثر نہ بن سکتا ہو اس میں وہ خاموش رہے اور دعا پر اکتفا کرے۔

۱۵۔ہندی ڈیلی راشٹریہ سہارا کے نمائندہ نے ۱۶/اگست ۲۰۰۵ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔یہ انٹرویو دینک

جاگرن میں چھپی ہوئی ۱۶/ اگست ۲۰۰۵ کی اس خبر پر تھا جس کا عنوان یہ تھا: دیش ہت میں الپ سنکھیکوں کی سوچ ختم کریں (سپریم کورٹ)۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ دستور ہند سے اقلیتوں کی فہرست ختم کرنا کوئی سادہ بات نہیں۔ یہ دستور میں تبدیلی کا معاملہ ہے اور موجودہ حالت میں پارلیمنٹ اس پوزیشن میں نہیں ہے کہ دستور میں کوئی تبدیلی کر سکے۔ دوسری بات یہ کہ دستور ہند میں تبدیلی کا موجودہ رجحان خود صحیح نہیں۔ آزادی کے بعد سے بار بار دستور میں ترمیم کی گئی ہے اور نیے نیے قانون بنائے گیے ہیں اس طرح کی باتوں سے دستوری اور قانونی استحکام ختم ہوجاتا ہے۔ حقیقی ترقی مسلسل جدوجہد (sustainable effort) چاہتی ہے۔ اور آئے دن کی ترمیمات کے ماحول میں ایسا ہونا ممکن نہیں۔

۱۶۔ ہندی ویکلی سہارا سے (نئی دہلی) کی نمائندہ رما شکلا نے ۱۶ اگست ۲۰۰۵ کو صدر اسلامی مرکز کا تفصیلی انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر مسلم مسائل سے تھا۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ مسلمانوں میں الگاؤواد کا مزاج ان کی ترقی میں رکاوٹ ہے۔ اس کو ختم ہونا چاہیے۔ دوسری چیز تعلیم ہے۔ مسلمانوں کا ہر مسئلہ تعلیم سے جڑا ہوا ہے۔ تعلیم بڑھ جائے تو تمام مسئلے اپنے آپ ختم ہوجائیں گے۔ الیکشن میں ہندو اور مسلمان دونوں کی یہ سوچ ہوگئی ہے کہ یہ دوست پارٹی ہے اور یہ دشمن پارٹی ہے۔ یہ سوچ غلط ہے۔ اس کے بجائے مثبت ذہن سے پارٹیوں کے ساتھ معاملہ کرنا چاہیے۔

۱۷۔ انٹر ریلجس اینڈ انٹرنیشنل فیڈریشن فار ورلڈ پیس (IIFWP) کے تحت ۱۶/ اگست ۲۰۰۵ کو ایک سیمینار ہوا۔ یہ سیمینار نئی دہلی کے انڈیا انٹرنیشنل سینٹر میں کیا گیا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور موضوع کی مناسبت سے ''اسلام اینڈ پیس'' کے بارے میں مختصر اظہار خیال کیا۔ آخر میں انھیں دعا (prayer) کے لیے کہا گیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر یہ دعا کی: **اللهم انت السلام ومنك السلام وإليك يرجع السلام، حينا ربنا بالسلام وأدخلنا دارك دار السلام، تباركت ربنا وتعاليت، يا ذالجلال والاكرام**۔ پھر اس دعا کا انگریزی ترجمہ پیش کیا۔ حاضرین نے اس دعا کو بہت پسند کیا۔

۱۸۔ نئی دہلی کے ہندی روزنامہ ویر ارجن کے نمائندہ مسٹر وکرم سنگھ نے ۲۲ اگست ۲۰۰۵ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ یہ انٹرویو ٹیلی فون پر ریکارڈ کیا گیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر سپریم کورٹ کے اس نوٹس سے تھا جو دار الافتاء اور دار القضاء کے متعلق جاری کیا گیا ہے۔ جواب میں بتایا گیا کہ سپریم کورٹ کا نوٹس جزئی طور پر درست ہوسکتا ہے مگر اس نوٹس کا تعلق دار القضاء یا دار الافتاء کے وجود سے نہیں ہے بلکہ مفتی صاحبان کے ایک غلط فتوے سے ہے جو عمرانہ کیس (مظفر نگر) کی صورت میں سامنے آیا ہے۔ اس کیس میں مفتی صاحبان نے بالواسطہ انداز میں جو فتویٰ دیا وہ کورٹ میں مداخلت کے ہم معنٰی تھا۔ کیوں کہ عمرانہ کا کیس ثابت شدہ طور پر زنا بالجبر کا کیس تھا۔ اس لیے وہ ایک فوجداری کیس تھا جو عدالت کے دائرے میں آتا ہے۔ اب یہ ہونا چاہیے کہ مفتی صاحبان اور ان کے ہم نوا اعلان کے ساتھ یہ مان لیں کہ انھوں نے غلطی کی۔ عمرانہ کے معاملے میں ان کو خاموش رہنا چاہیے تھا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر مفتی صاحبان اور ان کے ہم نوا اعلان کے ساتھ اپنی غلطی مان لیں تو اس کے بعد سپریم کورٹ کا اعتراض اپنے آپ ختم

ہوجائے گا۔ ایک سوال کے جواب میں کہا گیا کہ مفتی صاحبان کو اور زیادہ تربیت یافتہ ہونا چاہیے۔

۱۹۔ پاکستان سے ایک خط ملا ہے، اس کا ایک حصہ یہاں نقل کیا جاتا ہے — سب سے پہلے میں خدا سے یہ دعا کرتا ہوں کہ آپ کا اور میرا باہمی تعلق ہوجائے۔ آپ جیسی شخصیت سے جس کا تعلق قائم ہوجائے وہ انسان کتنا اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرے گا۔ میرا تعلق ایک متوسط گھرانے سے ہے۔ ۲۰۰۱ میں جب میں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا تو میں بڑا احساسِ کمتری کا شکار تھا۔ میرے ٹیچر نے مجھے ایک کتاب دی جس کا نام تھا ''رازِ حیات''بس میری زندگی کی شروعات ایک اچھے اور نیے طریقے سے ہونا شروع ہوگئی۔ یہ کتاب پڑھنے سے پہلے بھی میرے اندر یہ جذبہ تھا کہ زندگی آپ سے کیا مانگتی ہے۔ وہ کس چیز کا سوال آپ سے کررہی ہے۔ پھر میں نے ''کتابِ زندگی'' خریدی۔ ان دونوں کتابوں میں ایسی تحریریں شائع ہوئی ہیں جنھوں نے دل کو موہ لیا۔ پھر مجھے آپ سے ملنے کا شوق ہوا۔ اتنی بڑی شخصیت سے کیسے ملا جائے، جب میں نے پتہ کیا تو افسوس کرتا رہ گیا کہ آپ کی رہائش انڈیا میں ہے (سید کامران، کراچی)

۲۰۔ جدّہ کے انگریزی اخبار عرب نیوز کے ایڈیٹر مسٹر سراج وہاب نے ۲۸/اگست ۲۰۰۵ کو نئی دہلی میں صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو ریکارڈ کیا۔ یہ انٹرویو دو قسطوں میں تھا اور تفصیلی تھا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر مسلم سیاست اور مسلم جہاد اور مسلمانوں کی عالمی صورت حال کے بارے میں تھا۔ جوابات کا خلاصہ یہ تھا کہ موجودہ زمانے کے مسلمان کسی دوسری قوم کے ظلم اور سازش کا شکار نہیں ہورہے ہیں بلکہ وہ خود اپنے نااہل رہنماؤں کی غلط رہنمائی کی قیمت ادا کررہے ہیں۔ اس غلط رہنمائی میں سرفہرست اسلام کا پولیٹکل انٹرپریٹیشن ہے۔ اس غلط انٹرپریٹیشن نے ساری دنیا کے مسلمانوں کو منفی سوچ میں مبتلا کردیا ہے۔ وہ بے فائدہ لڑائی میں اپنی صلاحیتوں کو ضائع کررہے ہیں۔

۲۱۔ نئی دہلی کے سائی انٹرنیشنل سنٹر میں ۲۴ اگست ۲۰۰۵ کو ایک اجتماع ہوا۔ اس میں مختلف کیندریہ اسکولوں کے پرنسپل شریک ہوئے۔ اس کی صدارت جنرل چھبر نے کی۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز اس میں شریک ہوئے۔ وہاں انھوں نے ۴۵ منٹ کا خطاب کیا۔ اس خطاب کا موضوع تھا: ''بنیادی انسانی اقدار اور اسلام''۔ پروگرام کے مطابق ۳۰ منٹ کی تقریر تھی۔ اور اس کے بعد ۱۵ منٹ سوال وجواب ہوا۔ تقریر میں اس قرآنی آیت کی تشریح کی گئی: وتواصوا بالصبر وتواصوا بالمرحمة (البلد)

۲۲۔ زکوٰۃ فاؤنڈیشن آف انڈیا کا چار ستمبر ۲۰۰۵ کا اجلاس جامعہ ملیہ (نئی دہلی) کے ہال میں ہوا۔ اس کے آرگنائزر ڈاکٹر ظفر محمود ہیں۔ اس اجلاس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور زکوٰۃ کی اہمیت پر ایک تقریر کی۔ ان کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ زکوٰۃ سوشل سیکورٹی کا ایک نظام ہے۔ اصلاً وہ عبادت ہے۔ لیکن دوسرے عبادتی اعمال کی طرح اس میں بھی دنیوی زندگی کے مفاد کو شامل کردیا گیا ہے۔

۲۳۔ پاکستان سے ایک خط موصول ہوا ہے۔ اس کو یہاں نقل کیا جاتا ہے: آپ کی کتاب ''رازِ حیات'' پڑھنے کے بعد میری اس کتاب کے بارے میں یہ رائے ہے کہ اس کتاب کی ضرورت آج کے دور کے ہر انسان کو

ہے۔ کتاب میں جتنے بھی عنوانات ہیں سب میں مختلف امثال کے ذریعے انسانی نفسیات کو سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے اور ہر مثال دل میں اُترتی محسوس ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو جُداگانہ صلاحیتیں بخشی ہیں۔ ان ہی صلاحیتوں کی بدولت انسان ناممکن کو ممکن بنالیتا ہے۔ مایوسی کفر ہے لہذا ہمیں زندگی کے روشن پہلو پر نظر رکھنی چاہیے۔ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ کتاب مایوس انسانوں کے لیے اندھیرے میں روشنی کی ایک کرن ہے''۔ (سکندر حیات خاں، کراچی)

۲۴۔ کیرلا کی تنظیم اتحاد الشّبان المسلمین (ISM) کے زیر انتظام کالی کٹ میں دوروزہ سیمنار ۱۰۔۱۱ ستمبر ۲۰۰۵ کو ہوا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور اس کے اجلاس میں افتتاحی تقریر کی۔ ۹ ستمبر کی شام کی تقریر ہائی سن (Hyson) ہال میں ہوئی۔ اور ۱۰ ستمبر کی صبح کی تقریر کوزی کوڈ جبلی ہال (Kozhikode Jubly Hall) میں ہوئی۔ ان دونوں تقریروں میں اسلام اور مسلمان کا رول قرآن وسنت کی روشنی میں واضح کیا گیا۔ ان دونوں تقریروں میں اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ بڑی تعداد میں شریک ہوئے۔ یہ دونوں تقریریں ملیالم کے اخبار (۱۱ ستمبر) میں نمایاں طور پر شائع ہوئیں۔

۲۵۔ پرائم منسٹرس ہائی لیول کمیٹی کی میٹنگ نئی دہلی کے جامعہ ہمدرد کے ہال میں ہوئی۔ یہ میٹنگ ۶ ستمبر ۲۰۰۵ کو ہوئی۔ اس کمیٹی کے چیرمین جسٹس راجندر سچّر ہیں۔ اس میں انڈیا کے مختلف مقامات کے ممتاز مسلمان مدعو تھے۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ اس کا موضوع یہ تھا کہ پس ماندہ مسلم ذات کے لوگوں کو کس طرح تعلیم اور سروس میں رزرویشن دلایا جائے۔ صدر اسلامی مرکز نے اپنی تقریر میں کہا کہ رزرویشن کچھ افراد کے لیے وقتی طور پر کچھ فائدہ دے سکتا ہے، مگر مستقل فائدہ اور زیادہ ترقی کے لیے مسلمانوں کو خود محنت کرنا ہوگا۔ زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ مسلم نوجوانوں کو تعلیم کا شوق دلایا جائے اور زیادہ سے زیادہ محنت کر کے آگے بڑھنے کا حوصلہ پیدا کیا جائے۔

۲۶۔ مائنارٹی کمیشن کا ایک خصوصی اجتماع ۶ ستمبر ۲۰۰۵ کو نئی دہلی کے لوک نائک بھون میں ہوا۔ اس میں ہندو اور مسلم دونوں فرقے کے ممتاز افراد شریک ہوئے۔ اس کا موضوع یہ تھا کہ مختلف فرقوں کے درمیان ہم آہنگی کس طرح لائی جائے۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی اور اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ انھوں نے کہا کہ مختلف فرقوں کے درمیان ہم آہنگی کا سب سے بڑا ذریعہ باہمی اعتماد ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے حدیث کی روشنی میں اس کی وضاحت کی۔ انھوں نے بتایا کہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ ہر ایک دوسرے کا احترام کرے۔ یہ احترام مذہب اور کلچر کے فرق کے باوجود ہونا چاہیے۔ مائنارٹی کمیشن کے چیئر مین مسٹر ترلوک سنگھ نے اس جلسے کی صدارت کی۔

۲۷۔ ٹائمس آف انڈیا کے اسسٹنٹ ایڈیٹر (فیچرس) اَوی جیت گھوش نے ۲۱ ستمبر ۲۰۰۵ کو صدر اسلامی مرکز کا انٹرویو لیا۔ سوالات کا تعلق زیادہ تر مسلم ڈریس کوڈ سے متعلق تھا۔ اس سلسلے میں انھیں انگریزی کتاب ''حجاب'' پڑھنے کے لیے دی گئی۔ سوالات کا جواب دیتے ہوئے بتایا گیا کہ عورتوں کے لیے اسلامی لباس یہ ہے کہ وہ سادہ ہو،

اور چست نہ ہو۔ عورت کا پورا بدن لباس سے ڈھکا ہوا ہونا چاہیے۔ البتہ وجہ، کفّین اور قدمین کو فقہاء نے اس سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ ثانیہ مرزا کے لباس کے بارے میں فتوے کا جواب دیتے ہوئے بتایا گیا کہ فتویٰ یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے ذاتی مسئلے کے بارے میں شریعت کا مسئلہ دریافت کرے۔ یہ طریقہ بالکل غلط ہے کہ کوئی اور شخص ثانیہ مرزا کے بارے میں استفتاء مرتب کر کے مفتی کے پاس بھیجے۔ اور مفتی اس کا جواب دے۔ اس قسم کا فتویٰ، فتویٰ نہیں ہے بلکہ وہ ایک فتنہ ہے۔ اس قسم کے فتووں کا نتیجہ صرف یہ ہوتا ہے کہ اسلام بدنام ہو جاتا ہے۔ اس کے سوا اس کا کوئی مثبت فائدہ نہیں۔

۲۸۔ کمیشن فار انٹر ریلیجس ڈائلاگ (CBCI) کے زیر اہتمام ۲۵۔۲۶ ستمبر ۲۰۰۵ کو نئی دہلی میں ایک آل انڈیا سہ روزہ سیمنار رہا۔ اس کی کارروائی نئی دہلی کے ڈان باسکو اسکول (Don Bosco) کے ہال میں ہوئی۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ وہاں انھوں نے کی نوٹ ایڈریس (keynote address) کے طور پر ۲۵ ستمبر کے اجلاس میں ایک تقریر کی۔ اس کا عنوان یہ تھا:

Christian-Muslim Endeavours for a better society.

اس موضوع پر قرآن وحدیث کی روشنی میں انھوں نے آدھ گھنٹہ خطاب کیا۔ اس کا خلاصہ یہ تھا کہ مسلمانوں اور مسیحیوں کو باہمی اختلافات کو نظر انداز کر کے مشترک انسانی مقاصد کے لیے کام کرنا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ کرسچین کمیونٹی فارمل ایجوکیشن کے میدان میں اچھا کام کر رہی ہے۔ مگر انفارمل (informal) ایجوکیشن کا میدان ابھی خالی ہے۔ اس میدان میں دونوں متحدہ کوشش سے مفید کام کر سکتے ہیں۔

۲۹۔ انورت مومنٹ کا آشرم نئی دہلی میں واقع ہے۔ اس تنظیم کی طرف سے مہرولی میں ۲۶ ستمبر ۲۰۰۵ کو ایک جلسہ ہوا۔ اس کا موضوع ''کمیونل ہارمنی'' تھا۔ اس کی دعوت پر صدر اسلامی مرکز نے اس میں شرکت کی۔ اور کمیونل ہارمنی کے موضوع پر ایک تقریر کی۔ اس جلسے میں ہندو مرد اور عورتیں بڑی تعداد میں شریک ہوئیں۔ ایک حدیث (لا تغضب) کی روشنی میں بتایا گیا کہ سماج کے اندر ہمیشہ اشتعال انگیزی کے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ ایسی حالت میں صحیح طریقہ یہ ہے کہ اشتعال انگیزی پر صبر کیا جائے۔ اشتعال انگیزی کے واقعات کو ختم کرنا ممکن نہیں۔

۳۰۔ نئی دہلی کے سائی انٹرنیشنل سنٹر میں ایک پروگرام ہوا۔ اس میں مختلف سرکاری اسکولوں کے پرنسپل بلائے گیے تھے۔ یہ پروگرام ۲۸ ستمبر ۲۰۰۵ کو ہوا۔ اس میں خطاب کرنے کے لیے صدر اسلامی مرکز کو دعوت دی گئی۔ تقریر کا موضوع تھا: ''بیسک ہیومن ویلوز اِن اسلام'' ۳۰ منٹ تقریر کے لیے اور اس کے بعد ۱۵ منٹ سوال جواب کے لیے۔ تقریر کے بعد حاضرین کو CPS کا انگریزی لٹریچر تقسیم کیا گیا۔ ایک پرنسپل نے سوال کیا کہ اسٹوڈنٹ اگر شرارت کرے تو اس کو کس طرح قابو میں لایا جائے۔ جواب میں بتایا گیا کہ طلبہ میں اس زمانے میں جو انارکی پیدا ہوئی ہے اس کا سبب یہ ہے کہ ٹیچر لوگ صرف پروفیشنل ٹیچر بن گیے ہیں۔ ان کے دل میں طلبہ کے لیے وہ خیر خواہی نہیں ہوتی جو اپنے بیٹے کے لیے ہوتی ہے۔